جلد:۵، شمارہ:۳
جولائی-ستمبر ۲۰۱۸ء
ISSN : 2394-5567
S.No. 15

دبیر

مدیر
احمد نوید یاسر ازلان حیدر

DABEER
July-September 2018
S.No. 15

ISSN : 2394-5567
S.No. 15
Vol.: 5, Issues : 3
July-September 2018

DABEER

Editor:-
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

ISSN:- 2394-5567 (UGC No. 47011) S.No. 15

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر (فردوسیؒ)

دبیر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیر یڈ سہ ماہی ادبی و تحقیقی جریدہ)

جلد۔۵ شمارہ۔۳

جولائی ۔ستمبر ۲۰۱۸ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی

پروفیسر عبدالقادر جعفری، الہ آباد

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، لکھنؤ

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، بھوپال

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈائرکٹر آئی پی آر، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

پروفیسر سید محمد اصغر، صدر شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، شعبہ فارسی، کرامت ڈگری کالج، لکھنؤ

☆معاون مدیر☆

عاطفہ جمال

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	اداریہ	ازلان حیدر	۴
۲	خطیب اکبر یا فارسی کے ہر دل عزیز استاد	ڈاکٹر عابد حسین حیدری	۵
۳	افضل الفوائد کے فوائد عمومی	ڈاکٹر زہرہ خاتون	۱۰
۴	ہندوستان میں فارسی صحافت۔انیسویں صدی میں	ڈاکٹر عابدہ خاتون	۱۳
۵	مثنوی بحر العرفان	ڈاکٹر سرفراز احمد	۱۶
۶	اٹھارہویں صدی کے بعض ہندو تاریخ نویس	ڈاکٹر خورشید احمد	۲۲
۷	نگاہی بہ قصیدہ ای در توحید از امیر خسرو دہلوی	ڈاکٹر یاسر عباس	۲۶
۸	ہدایت المخلصین کا اجمالی تعارف	لطیف احمد سلمانی	۳۱
۹	زرتشتیوں کی ہندوستان آمد	عمر خلیق	۳۴
۱۰	سفرنامہ کی تاریخی اور سماجی اہمیت	ارشد جمیل	۳۷
۱۱	ایرج کی شاعری میں ماں کی عظمت	تحسین بانو	۴۲
۱۲	بساط الغنائم کا ایک تجزیاتی مطالعہ	آزاد حسین	۴۸
۱۳	بہمنی سلاطین اور فارسی زبان و ادب	ڈاکٹر شفیق احمد	۵۳

English Articles:

1. Contribution of eminent arabic & persian culture institutions in Bengal
   Miss Nazmun Nahar 3
2. Persian Literature and its affection to Non-Muslims during Mughal Period
   Dr. Rozina Khatun 14
3. Dr. Hira Lal Chopra- An Erudite scholar of persian
   Sk Md Hafizur 23
4. Sultan Shamsuddin Iltutamish-A Secular and farsighted sovereign
   Shama Rahmani 31
5. Dara - From defeat to death
   Mohammad Ibrahim Wani 40

اداریہ

دبیر(۱۵) شمارہ **جولائی۔ستمبر۲۰۱۸ء** شائع ہوکر آپ قارئین اور محبان علم وادب کی خدمت میں حاضر ہیں ہے اس شمارہ کے اردو کے حصہ میں پہلا مقالہ ڈاکٹر عابد حسین حیدری کا ''**خطیب اکبر یا فارسی کا ہر دل عزیز استاذ**''، دوسرا مقالہ ڈاکٹر زہرہ خاتون کا ''**افضل الفوائد کے عمومی**''، تیسرا مقالہ ڈاکٹر عابدہ خاتون کا ''**ہندوستان میں فارسی صحافت۔انیسویں صدی میں**''، چوتھا مقالہ ڈاکٹر سرفراز احمد کا ''**مثنوی بحر العرفان**''، پانچواں مقالہ ڈاکٹر خورشید احمد کا ''**اٹھارہویں صدی کے بعض ہندو تاریخ نویس**''، چھٹا مقالہ ڈاکٹر یاسر عباس کا ''**نگاہی بہ قصیدہ ای در توحید**''، ساتواں مقالہ لطیف احمد سلمانی کا ''**ہدایت المخلصین کا اجمالی تعارف**''، آٹھواں مقالہ عمر خلیق کا ''**زرتشتیوں کی ہندوستان آمد**''، نواں مقالہ ارشد جمال کا ''**سفرنامہ کی تاریخی اور سماجی اہمیت**''، دسواں مقالہ تحسین بانو کا ''**ایرج کی شاعری میں ماں کی عظمت**'' گیارہواں مقالہ آزاد حسین کا ''**بساط الغنائم کا ایک تجزیاتی مطالعہ**'' اور آخری مقالہ ڈاکٹر شفیق احمد کا ''**بہمنی سلاطین اور فارسی زبان وادب**'' شامل ہے جو کہ تمام کے تما اپنے عنوان کے اعتبار سے اپنی اہمیت پر خود روشنی ڈال رہے ہیں۔

شمارہ کے انگریزی حصہ میں بنگال کے عربی وفارسی کے اداروں کی خدمات پر محترمہ نجمن نہار کا مقالہ، فارسی ادب اور مغلیہ عہد میں اسکا غیر مسلموں پر اثر پر ڈاکٹر روزینہ خاتون کا مقالہ، ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا پر شیخ محمد حفظ الرحمٰن کا مقالہ، سلطان شمس الدین التتمش پر شمع رحمانی کا مقالی اور داراشکوہ شکست سے موت تک کے عنوان سے محمد ابراہیم وانی کا مقالہ خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

جریدہ کی پانچویں جلد کا یہ تیسرا شمارہ اپنے اردو اور انگریزی دونوں حصوں کے مقالات کے عناوین کے اعتبار سے خاصی اہمیت کا حامل ہے امید ہے قارئین اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

ازلان حیدر

ڈاکٹر عابد حسین حیدری
صدر شعبۂ اردو ایم جی ایم (پی جی) کالج، سنبھل

خطیب اکبر یا فارسی کا ہر دل عزیز استاد

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو، وہ خواب ہیں ہم

شادؔ عظیم آبادی کے درج بالا مشہور زمانہ شعر کے مصداق بلبل خوش بیان استاد محترم خطیب اکبر مولانا مرزا محمد اطہر مرحوم کی ذات گرامی تھی۔ جو اپنے عہد کے مشہور خطیب اور بے مثل استاد تھے۔ آپ کی ولادت ۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کے علمی وادبی خانوادے میں ہوئی۔ والد ماجد فخر الواعظین مولانا مرزا محمد طاہر اپنے عہد کے مشہور واعظ اور خطیب تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی ہونے کی وجہ سے ۱۹۴۴ء میں مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں داخلہ کرایا گیا۔ جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ تین چار سال زیرِ تعلیم رہ کر وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے سلطان المدارس لکھنؤ چلے گئے اور ۱۹۵۸ء میں صدر الافاضل کی اعلیٰ سند حاصل کی۔ بعد ازاں ۱۹۶۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۶۲ء میں فارسی زبان وادب میں ایم اے کی سند حاصل کرنے کے بعد شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ میں ۱۹۶۳ء میں فارسی کے لیکچرر منتخب ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں شیعہ ڈگری کالج (آرٹس) کے پرنسپل انچارج کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۹۹ء میں اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ کالج کی مصروفیات، درس وتدریس کے علاوہ موصوف اپنے عہد کے مایہ ناز خطیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ فروری ۲۰۱۶ء میں دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔

راقم الحروف حافظے کی بنیاد پر چار دہائی قبل کے اس لکھنؤ کی بات کر رہا ہے جس میں آقائے شریعت مولانا کلب عابد، ذاکر فاتح فرات مولانا کلب صادق، خطیب الایمان مولانا طاہر جرولی، خطیب اعظم مولانا غلام عسکری، شہنشاہ تاریخ مولانا زین العابدین، رئیس الواعظین مولانا کرار حسین واعظ جیسے خطبا اپنی خطابت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ لیکن جو شخصیت اپنی زبان دانی رواں اور سلیس طرز خطابت سے اپنی شناخت قائم کر کے لکھنوی خطابت کی پہچان بن چکی تھی۔ وہ شخصیت استاذی مولانا مرزا محمد اطہر صاحب قبلہ کی تھی۔ ہم نوجوانوں کو ان کی خطابت اس لئے پسند خاطر تھی کہ ان کی مثالیں آسان اور بالکل سامنے کی ہوتی تھیں۔ وہ بڑے سے بڑے اور مشکل سے مشکل مسئلے کو بھی سامنے کی مثالوں سے آسان بنا دیتے تھے۔ ان کی مسحور کن خطابت آج کی طرز ذاکری سے بالکل مختلف عالمانہ شان کی ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی عالم یا علمی شخصیت کی مجلس چہلم کو اکثر وبیشتر خطیب اکبر ہی خطاب فرماتے تھے۔ نصف صدی تک مغل مسجد بمبئی کے تاریخی عشرہ کو خطاب کر کے انہوں نے اپنی عالمانہ دسترس اور عوام وخواص پسند خطابت کا لوہا منوایا۔ اپنی فصاحت وبلاغت اور طرزِ ادا سے اپنی خطابت کو انہوں نے بمبئی کے اس مجمع میں مقبول عام بنایا جہاں پورے ہندوستان کے لوگ ان کے سامع ہوتے تھے گویا وہ کہہ رہے ہوں:

میں نے تکمیل کو پہنچائے فصاحت کے اصول
میری ترمیم کا محتاج ہر افسانہ رہا

ذاکری سے قطع نظر خطیب اکبر کی دوسری حیثیت ایک استاد کی تھی۔ مادر علمی سلطان المدارس کے جید اساتذہ مولانا محمد سید محمد، مولانا سید حسین، مولانا محسن نواب، بابائے منطق مولانا عبد الحسین، مولانا الطاف حیدر محمد آبادی، نادرۃ الزمن مولانا ابن

حسن نونہروی جیسے علمائے کرام اور اپنے والد محترم مولانا مرزا محمد طاہر کی تربیت سے جہاں خطابت میں اپنی شناخت قائم کی وہیں شیعہ کالج لکھنؤ میں بہ حیثیت استاد ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فارسی زبان وادب کے استاد کی حیثیت سے ان کے سامنے جن حضرات نے زانوئے ادب تہہ کیا ہے۔ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ خطیب اکبر اس پیشے کے اکابرین میں گنے جائیں گے۔ ان کے شاگرد اس بات کے گواہ ہیں بقول غالب:

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

راقم الحروف کو خطیب اکبر کی شاگردی ان دنوں میسر آئی جب موصوف آرٹس کالج کے انچارج پرنسپل تھے۔ کبھی کبھی دفتری مصروفیات ہم طلبا اور استاد محترم کے بیچ حائل ہو جاتیں لیکن اس رکاوٹ کو خطیب العرفان مولانا مرزا محمد اشفاق صاحب یا مشہور استاد شاعر اعجاز لکھنوی صاحب ختم کر دیتے۔ لیکن جو بات خطیب اکبر کے درس کی ہوتی تھی وہ پوری ہوتی نہیں دکھتی تھی۔ آج جب کہ ان کا یہ شاگرد خود ایم جی ایم پوسٹ گریجویٹ کالج کا پرنسپل ہے تو وہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جب استاد ہم طلبا سے فرماتے تھے۔ ''معاف کیجئے گا آج کچھ ضروری کام ہے۔'' آج جب ہم کسی ضروری کام میں مصروف ہوتے ہیں تو یہی جملے اپنے طلبا کے سامنے دہراتے ہیں۔

آج جب یہ سطریں تحریر کر رہا ہوں تو شیعہ کالج کے اساتذہ ذہن کے دریچوں میں ابھرنے لگے۔ تاریخ کے استاد جناب سید علی امام محمد آبادی اور مرزا مقرب صاحب کے درس کا خاص انداز اور اردو اساتذہ میں آغا محمد باقر اور کاظم علی خاں کا مخصوص انداز تخاطب لیکن جو بات خطیب اکبر کے درس کی تھی اس کا جواب نہیں فارسی کے طلبا زیادہ تر عربی بیک گراؤنڈ کے تھے۔ اور شبینہ کلاس ہونے کے سبب سلطان المدارس اور جامعہ ناظمیہ کے طلبا کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خطیب اکبر کو فارسی پڑھانے میں مزا آتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ فارسی زبان وادب کے وہی طلبا دلجمعی سے درس میں شامل ہوتے تھے۔ جو ان مدارس میں زیر تعلیم تھے۔ ان طلبا کی فارسی قواعد تو بہتر ہوتی تھی لیکن جدید طریقۂ تدریس سے واقفیت خطیب اکبر کے درس سے ہوتی تھی بقول داغ:

سادگی بانکپن اغماض شرارت شوخی
تونے انداز وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے

خطیب اکبر کا درس تدریس کے اصول اس کی انفرادیت گویا ہم جیسے طلبا کو مستقبل کا استاد بنا رہی تھی۔ وہ بات بات میں خطیبانہ انداز بھی اپنا لیتے تھے۔ خاص کر انہوں نے جب شاہنامہ فردوسی کی تدریس کرائی تو گویا ہم رستم وسہراب کی جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ میری نظروں میں ان کا مخصوص انداز درس گردش کر رہا ہے۔ اور حافظ کا مشہور شعر میرے حافظے سے نوک قلم پر آ گیا:

گر چہ یاراں فارغند از یاد ما
از من ایشاں راہزاراں یاد باد

بات فردوسی کی کر رہا تھا اور یادوں کے کارواں سے حافظ کا شعر صفحۂ قرطاس پر ثبت ہو گیا۔ استاد محترم نے باتوں باتوں میں شاہنامہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لسانیات کے بہت سے گوشوں کو وا کیا۔ ایک دن درس میں فرمانے لگے۔ ۲۱ھ میں عربوں نے فتح ایران کی تکمیل کی۔ خلافت عباسیہ کے زمانے میں حکومت کی زبان عربی تھی۔ گو ایرانیوں نے عربی میں بڑی دستگاہ

حاصل کی لیکن اپنی مادری زبان کو کبھی نہیں چھوڑا۔جن حالات میں عربی کی ملاقات فارسی سے ہوئی تھی اس کے لحاظ سے عربی کے بے شمار الفاظ کا فارسی میں رائج ہونا ناگزیر تھا۔تاہم اس میل جول سے فارسی کا نقصان کم ہوا اور فائدہ زیادہ۔عربی الفاظ کے داخلہ سے فارسی کی وسعت اور جامعیت کو بہت ترقی ہوئی۔جس کا تھوڑا سا اندازہ شاہنامہ سے ہوتا ہے۔

شاہنامہ فردوسی کی تدریس سے قبل انہوں نے مثنوی کی تاریخ پر مفصل روشنی ڈالی اور بتایا کہ مثنوی میں دو طرح کے مضامین شامل کئے جاتے ہیں۔(۱)۔رزمیہ۔(۲)۔بزمیہ۔

رزمیہ مثنویوں میں یوسف زلیخا،لیلیٰ مجنوں،ساقی نامے اور شکارنامے ہیں۔اس ضمن میں انہوں نے واجد علی شاہ کی ضربت حیدریہ اور مفتی محمد عباس کی مثنوی من وسلویٰ کا خصوصیت سے ذکر کیا۔انہوں نے ایک دن اس درد کا اظہار کیا تھا کہ مذہبی مثنویوں کو فارسی اور اردو کے ناقدین نے خاطر خواہ جگہ نہیں دی جبکہ فنی اعتبار سے ان کا پایہ عشقیہ مثنویوں سے بلند تر ہے۔

استاد محترم کا خیال تھا کہ فردوسی پکا وطن پرست تھا۔وہ قدیم ایران کے بادشاہوں کے کارناموں کو بڑی آب وتاب سے دکھانا اور شاہ نامہ کو خالص فارسی زبان میں لکھنا چاہتا تھا۔لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بہت سے عربی الفاظ سے استفادہ کرنا پڑا۔انہوں نے بتایا کہ ناقدین اور مبصرین کا خیال ہے کہ شاہنامہ میں آٹھ اور دس فیصدی کے درمیان عربی الفاظ موجود ہیں۔

استاد محترم قصیدہ میں قاآنی کے بہت مداح تھے۔انہوں نے قاآنی کا مشہور ومعروف قصیدہ:

نسیم خلدمی وزد مگر زجوئے بارہا
کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزارہا

کی تدریس کرائی تو فن قصیدہ پر خاطر خواہ روشنی ڈالی۔انہوں نے بتایا کہ قاآنی کا یہ مشہور ومعروف قصیدہ جس کی تشبیب تو بہت عمدہ ہے لیکن بقیہ قصیدہ ان کے منقبتی قصیدہ:

بگردون تیرہ ابری بامدادن برشد ازدریا
جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

سے بہت کمزور ہے لیکن فارسی کے ناقدین ومحققین نے اسے اس لئے نصاب میں جگہ نہیں دی کہ یہ قصیدہ منقبتی قصیدہ ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قاآنی کے قصائد کے مطالعہ میں ان قصائد کو ضرور شامل کرنا چاہئے۔تاکہ اس کی قصیدہ گوئی کا صحیح اور متوازن جائزہ پیش کیا جاسکے۔درج بالا قصیدہ ۸۵/اشعار پر مشتمل ہے اور استاد محترم نے اس کے بیشتر اشعار پیش کر کے ہم طلبا کو مبہوت کر دیا۔ہمیں ان کے حافظے کا قائل ہونا پڑا۔انہوں نے جب ثامن الائمہ کی شان والا صفات پر مشتمل اس معرکتہ الآرا قصیدہ کے اشعار پیش کئے،جس میں ان کا سراپا بیان کیا گیا ہے تو سلطان العرب والعجم کی معرفت کے نور کا پرتو مسحور کئے دیتا تھا:

شدہ خورشید نور افشان بہ تاری جسم او پنہان
چو شاہ مصر در زندان چو ماہ چرخ در ظلما

یا درج ذیل اشعار:

لب غنچہ رخ لالہ برون آوردہ بت خانہ
زبس باران اران ژالہ بطرف گلشن و صحرا
بہ فیض او دمیدہ گل شمیدہ طرۂ سنبل
کشیدہ از طرف بلبل بشاخ سرخ گل آرا

اور جب راقم کو فروری ۲۰۱۵ء میں ثامن الائمہ امام غریب الغربا کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا اور حضرت سلطان العرب والعجم کی سرکار سے قرعہ اندازی میں پرچم امام رضا علیہ السلام کا تحفہ ملا تو استاد محترم کے پڑھائے ہوئے قاآنی کے قصیدہ کے یہ اشعار حافظہ کے جھروکوں سے زبان پر آ گئے:

تو گوئی اہل این کشور برہنہ پا برہنہ سر
چمن در خشک سال اندر بہ ہامون بہر استسقا
چمن از فر فرور دین چنان نازان بدشت چین
کہ طوس از فرشاہ دین برین نہ گنبد خضرا

واضح ہو کہ یہ قصیدہ امام ثامن ضامن کا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی شخص محمدؐ و آل محمدؐ کی ثنا خوانی میں حق ثنا خوانی ادا کر سکے۔ لیکن بقول استاد محترم یہ ایسا منقبتی قصیدہ ہے کہ اگر اس کی ایک چوتھائی خوبیوں کے برابر بھی کوئی شاعر اظہار ذکر کرے تو دوستداران محمدؐ و آل محمدؐ اسے جس لقب سے یاد کریں بجا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ قاآنی کے اس قصیدہ پر فصاحت کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ فصاحت کے ساتھ ساتھ بلاغت کی آمیزش شاعری کی ممتاز صورت دکھا رہی ہے۔ خاص کر قاآنی نے اس قصیدہ میں بہار کی جو تصویر کشی کی ہے وہ ایران کی بہار کو دیکھے بغیر نہیں سمجھ میں آ سکتی۔ استاد محترم نے یہ بات اسی وقت کہی تھی جب میرے جیسے نوآموز کے شعور میں وہ پختگی نہیں آئی تھی۔ جب حقیر نے ایران کی بہار کو قریب سے دیکھا تو قاآنی کے ذیل میں استاد گرامی کے یہ جملے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

استاد محترم خطیب اکبر قصیدہ کے بعد رباعی کے فن پر گہری دسترس رکھتے تھے۔ ثامن الائمہ کی بارگاہ میں شرف یابی کے بعد جب معصومۂ قم کی بارگاہ میں حاضری کے لئے مشہد سے تہران کا سفر بذریعۂ ریل کیا تو پہلا اسٹیشن خیام تھا۔ یہیں پر ہم نے مغربین کی نماز ادا کی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ خیام کی قبر یہیں ہے اس وقت شیعہ کالج لکھنؤ کا کلاس روم نظروں کے سامنے آ گیا اور خیام کی رباعی زبان پر آ گئی:

ایں قافلۂ عمر عجب می گزرد
در باب دمی کہ از طرب می گزرد
ساقی غم فردائی حریفان چہ شوری
پیش آر پیالہ کہ شب می گزرد

خطیب اکبر نے اس رباعی کی تفہیم جس انداز میں کی تھی۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتا لیکن ایک رباعی کی تفہیم کرتے ہوئے خطیب اکبر نے فرمایا کہ اس رباعی کے افکار اور شنکر آچاریہ کے فلسفۂ دویت وادویت ایک دوسری کی تطبیق کرتے نظر آتے ہیں۔ بعد میں خطیب اکبر کے اس اشارے کو سامنے رکھ کر میں نے خیام کی رباعیوں کا مطالعہ کیا اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں انٹرنیشنل سیمینار میں ''خیام اور ویدانت'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ خیام کی وہ رباعی ملاحظہ فرمائیں جس میں خطیب اکبر نے فلسفۂ ادویت کی نشاندہی کی تھی:

درکار گہ کوزہ گری رفتم دوش
دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ناگاہ یکی کوزہ بر آورد خروش

کو کوزہ گرو کوزہ خرو کوزہ فروش

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خطیب اکبر چاہے منبر خطابت پر ہوں یا مسند درس پر، زباں کے بارے میں سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ الفاظ کے برمحل استعمال کی سند لکھنوی شعرا کے کلام سے یا مجدین فن یا خطباء کے جملوں سے پیش کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جدت پسندی ایسا ہتھیار ہے جس سے بہت سے میدانوں میں مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر زبان کے میدان میں اس ہتھیار سے آنکھیں بند کر کے کام لینا زبان کی گردن پر کند چھری چلانا ہے۔ آج ہمارے بیشتر ذاکرین اس رمز سے نا آشنا ہیں اور دوسرے ممالک کے ذاکرین کے بے ترتیب و بے محل جملوں کو پیش کر کے خطابت کے فن کو مجروح کر رہے ہیں۔ اس قحط الرجال میں جب علما کی توہین بہت سے ذاکرین اپنا شعار سمجھتے ہیں خطیب اکبر کی وہ تقاریر جو علما و مراجع کی خدمات پر کی گئی ہیں، بہت یاد آتی ہیں:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ڈاکٹر زہرہ خاتون
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

افضل الفواید کے فواید عمومی

''افضل الفواید'' حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کا وہ مجموعہ ہے جسے آپ کے مرید خاص حضرت امیر خسرو دہلوی نے اکٹھا کر کے کتابی شکل عطا کی۔ امیر خسرو کا شمار ان خوش قسمت افراد میں کیا جا سکتا ہے جو نہ صرف اپنے شیخ کی صحبت سے بہرہ مند ہوئے بلکہ ان کی بزرگی کے معترف بھی کہلائے جس کا عقیدتمندانہ اظہار انہوں نے اپنے تصنیف ''افضل الفواید'' کے توسط سے کیا ہے۔ اگر چہ ملفوظات کی فہرست کا ہم جائزہ لیں تو افضل الفواید کا نام آخر میں نظر آتا ہے۔ دراصل یہ حضرت کے اقوال کا مجموعہ تو ہے لیکن اس سے پہلے ایک دوسرا مجموعہ ''فواید الفواید'' مرتبہ امیر حسن سنجری کے نام سے منظر عام پر آچکا تھا جسے بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی لہذا خسرو کے اس ملفوظات کے مجموعے کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ بہر کیف یہ ایک اہم دستاویز ہے جو فقہ و تصوف کی تعلیمات اور اسرار و رموز طریقت سے لبریز ہے۔ یوں تو امیر خسرو کو حضرت سے ابتداء سے ہی ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا۔ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ایک عبارت کے مطابق:

''عشق و شیفتگی میان مرید و مراد چنانکہ درمیان امیر خسرو دہلوی و حضرت نظام الدین اولیا وجود داشت در تاریخ تصوف و عرفان نظیر آن کمتر بہ چشم می خورد۔''(۱)

لیکن با قاعدہ طور پر جب آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے تو بحیث مرید ''افضل الفواید'' کا ایک حصہ حضرت کی خدمت میں پیش کیا جسے انہوں نے بہت پسند کیا، خسرو کی ہمت افزائی کی اور فرمایا کہ '' نیکو نوشتہ و نیکو نام کردہ'' یعنی تو نے خوب لکھا ہے اور نام بھی اچھا رکھا ہے۔ حضرت نے اس مسودہ کو جگہ جگہ سے درست بھی کیا اور حاضرین سے فرمایا کہ خسرو کے لئے واقعی یہ بات قابل فخر ہے کہ اس نے اتنی باتیں یاد رکھیں اور لکھیں حالانکہ وہ ہر وقت سر سے پاؤں تک خیالات کے سمندر میں غرق رہتا ہے یہ سن کر خسرو تعظیم بجالائے اور کہنے لگے کہ 'یہ تمام خیالات جو میرے ذہن میں آئے ہیں، آپ ہی کی ذات بابرکات کا ثمرہ ہیں۔ اس لئے کہ آپ ہی نے اپنی بابرکت تلقین سے میری تربیت کی ہے۔(۲)

مفتخر از وی بہ غلامی منم
خواجہ نظام است نظامی منم

''افضل الفواید'' ضخامت کے اعتبار سے اگر چہ مختصر ہے لیکن بعض لحاظ سے بے حد قابل قدر ہے۔ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اصل زبان فارسی ہے جو نہایت ہی سادہ و سلیس ہے اور اس فارسی نثر کا نمونہ ہے جو اس زمانے میں عام طور پر بولی جاتی تھی۔ کتاب کا عنوان اور نفس مضمون بھی امیر خسرو کی زبان کا احاطہ کرتے ہیں لہذا اس ضمن میں بھی کچھ عرض کرنا برمحل معلوم ہوتا ہے۔

خسرو دراصل کئی زبانیں مختلف اوقات اور مواقع پر اور کبھی بیکوقت بھی استعمال کرتے تھے۔ اول تو فارسی تھی، دوسری کو ہندوی کہنا چاہئے جو پھیلتی ہے تو ایک طرف ہندی بن جاتی ہے اور دوسری طرف اردو، اور جب وہ سمٹتی ہے تو دونوں زبانوں کے

فاصلے مٹ جاتے ہیں اور ایک ایسی زبان بن جاتی ہے جو عوام وخواص سبھی کے لئے قابل فہم ہو۔ان کا اصل مقصد بھی عام لوگوں کے ہر حلقہ تک رسائی حاصل کرنا،ان کی بات سمجھنا اور اپنی بات سمجھانا ہے۔اور اگر محبوب الٰہی کے دربار پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی یہی مقصد کارفرما نظر آتا ہے یعنی عوام وخواص تک اپنی بات پہنچانے والی زبان میں ان سے گفتگو کر کے اپنے پیغام کو اس طرح ان تک پہنچانا کہ وہ ان کے دل میں اتر جائے،اور وہ پیغام تھا احکام الٰہی کے منشاء کے مطابق برائیوں سے پاک ایسے معاشرہ کی تشکیل وتعمیر جہاں چھوٹے بڑے امیر،غریب کا امتیاز نہ ہو،جہاں جبر واستحصال کی گنجائش نہ ہو،سماج مساوات کا آئینہ دار ہو۔بہ الفاظ دیگر بات دین کی کہجاتی لیکن بڑی سہل زبان میں اور نہایت ہی پر سکون ماحول میں،چنانچہ کہیں نہ کہیں یہ عنصر بھی خسرو کی محبوب الٰہی سے قربت کا موجب نظر آتا ہے۔کتاب کے آغاز میں سنہ تاریخ ۲۴؍ذی الحجہ ۷۱۳ء بیان فرمائی ہے،ہر مجلس کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''دولت پای بوس حاصل شد'' یا ''دولت پا بیوس میسر شد''

یہ ملفوظات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔پہلا حصہ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر شیخ کے ایسے اقوال وواقعات اور احادیث بیان فرمائی ہیں جو فقہ وتصوف کی تعلیمات اور اسرار ورموز طریقت کا بیش بہا خزانہ ہیں جبکہ دوسرا حصہ قصص وحکایات پر مشتمل ہے۔اسی سے ایک عبارت ملاحظہ ہو:

''این گوہر گنج علوم غیبی واین درآثار زواہر لاریبی از خزانۂ دل خواجہ راستان ملک المشائخ والا رضین قطب الوقت مجمع الاسناد والارشاد حجۃ اللہ علی العباد مبین الفرغ والاصول الجامع بین المعقول والمنقول علم البلاغۃ نظام الحق والشرع والدین شیخ الاسلام و المسلمین وارث الانبیاء والمرسلین متع اللہ المسلمین بطول بقاۂ وادام علین نعمت لقاۂ وخفی اللہ تعالی اسلافہ بالعز والاکرام والرضوان التام بحرمت محمد علیہ افضل الصلوت والسلام آمین رب العالمین جمع کردہ آمد۔آنچہ از زمانۂ شمع جمع ملوک راز عین لفظ ایشان ومعانی آن کہ بسمع رسید بقدر فہم خود درین مجموعہ کہ نام اوست افضل الفوائد عشۃ آمد مشتمل بر تواریخ مختلف بہر محلی کہ بخدمت پیوستہ شدہ است۔تاریخ بیست وچہارم روز یکشنبہ ماہ ذی حجہ سنہ ثلث عشر وسبع مأۃ بندہ امیر خسرو نحیف کہ یکی از بندگان درگاہ ملک المشائخ فی الارضین است خسرو لاچین کہ جامع این افضل الفوائد است،دولت پا بیوس آن قطب عالم حاصل کرد۔ہمان زمان کلاہ چہار ترکی بر سر بندہ نہادند وبشرف بیعت مشرف گردانیدند۔(۳)

عام طور پر عشاء کی نماز کے بعد خسرو اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے،اس وقت حضرت اپنے وظایف وریاضت میں مشغول ہوتے اس درمیان جو بھی موضوع ہوتا،اس پر گفتگو ہوتی اور ساتھ ہی خسرو اسے قلمبند کرتے جاتے۔مثال کے طور پر ایک جگہ کلاہ کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

''طافیہ کلاہیست کہ آن دوترکی می باشد۔سوم کلاہیست کہ سہ ترکی می باشد،چہارم چہار خانہ دارد،اول خانہ شریعت دوم خانہ طریقت،سیوم خانہ معرفت،چہارم خانہ حقیقت،پس ہر کہ درین خانہ استقامت یافت طافیہ اوراواجب است۔(۴)

اسی طرح کلاہ ''چہار ترکی'' کی تفصیل ایک دوسری جگہ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں (۱) کہ خانہ اول اسرار وانوار،خانہ دوم محبت وتوکل،خانہ سوم عشق واشتیاق اور چہارم رضا وموافقت۔گویا اس مقام تک پہونچنے کے لئے مندرجہ بالا صفات کا پایا جانا لازم ہوگا۔اسی طرح جہاں نماز کا بیان ہے وہاں کئی قسم کی نفل نمازوں کی تفصیل بیان کی ہے جن میں چاشت،نماز تسبیح سلالہ،اس کے علاوہ ہر روز کی مناسبت سے دو رکعت کی نفل نمازیں۔دوسری وہ نمازیں جو واجب ہیں۔یا سنت ہیں،نیز فرض نمازوں کے احکامات وغیرہ۔اسی طرح جہاں روزوں کا بیان ہے اس میں ماہ رمضان کی برکت فرض روزوں کی افادیت،نفل روزوں کے ثواب،ان کے مقررہ ایام ان سب پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

اسی طرح ایک اور موضوع سماع سے متعلق بھی ہے، اس سلسلے میں کئی ایک واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت سماع کو تو پسند فرماتے تھے لیکن اس میں دستک (دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجانا) اور مزامیر کے استعمال کو معیوب اور ناشایستہ خیال کرتے تھے۔ اسی طرح حالت وجد میں یا رقص کی کیفیت میں ہاتھ پاؤں ہلانا ان کے نزدیک معیوب نہ تھا لیکن اس کیفیت میں چیخنا، چلانا، شور وغل برپا کرنا اسے وہ برا سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اہل سماع نے کبھی ایسا نہ کیا اور نا ہی یہ کاملوں کا طریقہ ہے۔ اس قسم کے طرز عمل کی توقع صرف انہی لوگوں سے ہوسکتی ہے جو مذہب طریقت سے نا آشنا ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ قصص وحکایات انبیاء سے متعلق ہے۔ جس کا آغاز خسرو نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''بار دوم بندہ روی بر زمین آورد و فرمان شد کہ بگو التماس کردم کہ پیش از این بندہ از زبان مخدوم بندہ نواز ہر چہ شنیدہ است، آنرا در قلم آوردہ است و جلدی مرتب کردہ نام ''افضل الفواید'' کردہ بشرف نظر منظور گشتہ پس درین وقت نیز اگر برحمت فرمان شود ہر چہ از زبان مخدوم شنیدہ شود آن را در سلک تحریر کشیدہ آید تا در جلد مرتب گردد''۔(۵)

اس حصہ کی شروعات حضرت آدم علیہ السلام سے کی ہے۔ اور دوسرے انبیاء کے ذکر میں مثلاً حضرت یوسف کا قصہ، حضرت نوح کے واقعات، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل کے واقعات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں، جو کہ شیخ کی زبانی قلمبند کئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کی افادیت ان معنوں میں بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان واقعات وحادثات کے پس منظر میں حضرت کی خانقاہ کے کچھ حالات بھی ضمنی طور پر قلمبند ہوتے گئے ہیں خاص طور پر ان لوگوں کا بھی تذکرہ موجود ہے جو اکثر و بیشتر حضرت کے گرد و پیش رہا کرتے، ان میں خواجہ حسن، مولانا وجیہ الدین پایلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، مولانا برہان الدین غریب، خواجہ عثمان سیاح، مولانا جمال الدین پاسنوی، مولانا شمس الدین یحییٰ، مولانا فخر الدین رازی وغیرہ۔

حواشی:

۱۔ دانش: ص ۴۳
۲۔ افضل الفواید: ص ۱۹۱
۳۔ افضل الفواید: ص ۲
۴۔ افضل الفواید: ص ۳
۵۔ افضل الفواید: ص ۱۲۹

منابع و مآخذ:

۱۔ افضل الفواید: امیر خسرو دہلی ۱۸۸۷ء
۲۔ اخبار الاخیار: عبدالحق دہلی ۱۳۰۹ھ
۳۔ شعر العجم، جلد ۲: شبلی نعمانی
۴۔ فواید الفواد: امیر حسن سجزی
۵۔ تاریخ فرشتہ: ابوالقاسم فرشتہ، لکھنؤ ۱۸۶۴ء
۶۔ دانش (نمبر ۸۰): فصلنامہ ۱۳۸۴
۷۔ امیر خسرو: وحید مرزا۔ نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، دہلی
۸۔ سیرت حضرت امیر خسرو

ڈاکٹر عابدہ خاتون
الہ آباد

ہندوستان میں فارسی صحافت: انیسوی صدی میں

"وتفقد الطّیر فقال مالی لا اری الھُدھُد ام کان من الغآئبین لاعذبنہٗ عذابا شدیدا اولا زبحنہٗ او لیاتینّی بسلطن مبین فمکث غیر بعید فقال احطتّ بمالم تحط بہ وجتك من سبایقین"
(سورۂ نمل، آیت۲۰ تا۲۲)

(اور پرندوں کا جائزہ لیا تو بولا مجھے کیا ہوا کہ میں ھدھد کو نہیں دیکھتا یا وہ واقعی حاضر نہیں۔ضرور میں اسے سخت عذاب کروں گا یا ذبح کر دوں گا یا کوئی روشن سند میرے پاس لائے تو ھدھد کچھ زیادہ دیر نہ ٹھرا اور آ کر عرض کی کہ میں وہ بات دیکھ آیا ہوں جو حضور نے نہ دیکھی اور میں شہر سبا سے حضور کے پاس ایک یقینی خبر لایا ہوں۔)

چیونٹی چیونٹے کی سر گوشیاں بھانپ لینے والے پیغمبر حضرت سلیمان غضبناک ہوکر بولے کہ اے ھدھد کہاں غائب ہے؟ آنے تو دو اچھی خبرلوں گا اس کی۔مگر یہ کہ وہ مجھے کوئی اہم بات بتائے۔اتنے میں ھدھد حاضر ہوتا ہے اور نہایت عجز وانکساری اور ادب وتواضع کے ساتھ معافی چاہ کر یہ کہکر انکا غصہ ٹھنڈا کر دیتا ہے! جناب والا میرے پاس ایسی خبر ہے کہ جس سے سرکار بھی لاعلم ہیں۔حضرت سلیمان وھدھد کا قصہ ہمیں بتا تا ھے کہ خبر' اخبار کی کیا حیثیت تھی اور بڑے بڑے فرماں روا بھی اس کے محتاج و نیاز مندوں میں سے تھے۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خبر جوئی وخبر رسائی کا سلسلہ ابتدأ آفرینش سے کم وبیش موجود رہا ہے پرچہ نویسی' وقا یٔع نگاری' روز نامچہ نویسی ہر عہد میں نظم زندگی کا لازمی عنصر رہے ہیں۔

چھاپا خانہ کی ایجاد کے پہلے خبر رسانی کا طریقہ زبانی وقلمی تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے طباعت کا وسیلہ اپنایا تو ''اخباری خطوط'' سے یہ سلسلہ شروع ہوا صحافت لفظ صحیفہ سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہوتے ہیں۔مگر صحافت سے ایک ایسا مطبوعہ مواد بھی مراد لیا جا تا ھے جو مقررہ وقت پر شایع ھوتا ھے اس اعتبار سے اخبار ورسایل کو صحیفہ بھی کہہ سکتے ھیں۔ورنہ صحافت بنیادی طور پر اخبار نویسی ورسالہ نگاری کے عمل کا نام ھے۔تازہ خبریں حالات حاضرہ پر تبصرہ اور مختلف قسم کے مضامین جمع کر کے انہں معیین وقت سے شائع کرنا صحافت ھے۔خبر اور خبر سے متعلقہ مواد کا حصول ،جمع کاری، ترتیب وتدوین ،تنقید وتبصرہ اور فیچر نگاری کے بعد اخبار رسالہ، ریڈیو، ٹیلی ویژن ،قلم وتحریر کے وسیلہ سے اس کی اشاعت وتقسیم ''صحافت'' ہے۔مختصراً یہ کہ صحافت شب و روز کے حالات کی عقاسی نیز ان حالات کے پس منظر سے ابھرنے والے انسانی نظریات کی ترویج واشاعت اور حالیہ امور سے متعلق موضوعات کی ترسیل وتبلیغ کا نام ہے۔مگر اپنے نظریہ کا بگھار دیکر۔

دراصل ھندوستان میں صحافت کا آغاز احتجاج اور بغاوت کے حصول میں ہوا تھا۔سب سے پہلے مسٹر ولیم بوٹس نے ھندوستان پر فایز ایسٹ انڈیا کمپنی کے بداطوار، رشوت خور، انصاف دشمن اور صفاک انگریز حکمرانوں کی انسانیت سوز حرکتوں کو طشت از بام کرنے کی غرض سے ایک چھاپا خانہ قایم کر کے خبروں کی اشاعت کا اعلان کیا۔حکمران طبقہ میں اس اعلان سے تہلکہ مچ گیا اور ولیم بوسٹ کو بالآخرہ ۱۸اپریل ۱۷۶۸

''ھندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں اب ایسٹ انڈیا کمپنی ایک خودمختار حکمران بن چکی ہے ملک کی تجارت پر کمپنی کو انتھائی ظالمانہ اور تباہ کن اجارہ داری حاصل ہے لاکھوں انسان چند ایسے بد باطن فرنگیوں کے رحم وکرم پر زندگی بسر کرنے پر

مجبور ھیں جو عوام کو لوٹ کھسوٹ کر ان کی دولت سمجھ کر آپس میں تقسیم کر لیتے ھیں۔فوجیوں پر ظلم واستبداد کے باعث ملک مطلق العنانی کا شکار ھو کر رہ گیا ھے۔''

بہر حال ولیم بوسٹ نے انگریز حکام کے خلاف احتجاج کی جو شمع روشن کی تھی اس کی لو ایک دوسرے انگریز جیمس اگسٹس ھکی نے بجھنے نہ دی اور ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو ھندوستان کا سب سے پھلا انگریز اخبار ''ھکی گزٹ'' کے نام سے شایع کر کے انگریز حکام کی بداعمالیوں، بدعنوانیوں اور ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرنے کی مہم شروع کر دی اس کی اس کوشش کے خلاف انگریز حکام نے سخت کاروائی کی ۔عدالت نے ھکی کو چار ماہ قید اور پانچ سو روپیہ جرمانے کی سزا دی۔اسی طرح ایک دوسرے معاملے میں ھکی کو عدالت نے ایک سال کی قید اور دو ھزار روپئے جرمانے کی سزا دی۔لیکن ھکی نے ھمت سے کام لیا اور قید و بند میں رھتے ہوئے اپنا اخبار مسلسل جاری رکھا اور انگریز حکمرانوں کی نکتہ چینی کرتا رھا۔اس پر فرنگی حکمرانوں کے ظلم اور زیادتیاں اتنی بڑھ گئیں کہ اسے مجبورا اپنا یہ اخبار بند ھی کرنا پڑا۔

یوں تو ''ھکی گزٹ'' کی زندگی بہ مشکل دو برس ھی تھی لیکن اس کی تاریخی اھمیت کو دیکھتے ہوے کہا جا سکتا ھے کہ اسی گزٹ نے برصغیر میں بیباک صحافت کی بنیاد رکھی اور ۱۹۴۷ء تک فارسی اور اردو کے علاوہ مختلف زبانوں میں اخبارات نے اس کی پیروی مین تحریک آزادی کے ہراول دستے کا شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ھندوستانی صحافت کی تاریخ شاہد ھے کہ برٹش راج کے خلاف جد وجہد پر آمادہ کرنے اور عوامی شعور کو بیدار کرنے میں صحافیوں نے موثر کردار ادا کیا۔ان میں بعض غداری کے الزام میں قتل ہوئے ،جیل گئے اور صعوبتیں برداشت کی۔

انگریز صحافیوں کے بعد ھندوستان کا سب سے پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتہ سے شائع ہوا اس کے مدیر منشی سدا سکھ مرزا پوی تھے یہ اخبار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ابتداء میں اس کے کچھ شمارے ھی اردو میں نکل سکے اس کے بعد اس کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا گیا اور پھر ایک سال بعد فارسی اخبار کے ساتھ چار ورقی اردو ضمیمہ منسلک کیا گیا۔

جو اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا۔وہ فارسی اخبار کے ساتھ بھی بکتا تھا اور انفرادی طور پر بھی اس کی مانگ تھی۔یہ اخبار کم و بیش پانچ سال جاری رھا اس وقت تک انگریزی صحافت اپنی جڑیں کافی مضبوط کر چکی تھی۔ملک کے تین بڑے شہر کلکتہ، ممبئی اور مدراس میں انگریزی کے بیسوں اخبار و رسائل نکل رہے تھے۔

''جام جہاں نما'' کے بعد فارسی زبان میں راجہ رام موھن رای نے ۲۰ اپریل ۱۸۲۲ء کو ''مراۃ الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا لیکن انہوں نے ''جام جہام نما'' (ھفت روزہ) کی اشاعت کے ایک سال کے بعد ۱۴ اپریل ۱۸۲۳ء کو اپنا یہ اخبار ایسٹ انڈیا کمپنی کے پریس ایکٹ ۱۸۲۳ء کے خلاف احتجاج کرتے ھوئے بند کر دیا۔یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ ''جام جہاں نما'' کے بعد ادب نواز اور علم دوست غیر مسلم اردو اخبارات نکالے رھے اور اردو اور فارسی دونوں ھی اخباروں کے پہلے صحافی کا شرف بھی غیر مسلم صحافیوں کو حاصل ھوا۔ اس کے بعد فروری ۱۸۳۱ء کو مولوی سراج الدین نے ''آئینہ سکندری'' کے نام سے فارسی اخبار جاری کیا اس اخبار کو مرزا غالب کا تعاون حاصل تھا۔آئینہ سکندری میں غالب کی فارسی غزلیں شائع ھوتی تھیں اس اخبار کی اھم خوبی یہ تھی کہ ہر خبر کی سرخی کے نیچے ایک شعر بھی لکھا جاتا تھا۔

واجد علی شاہ نے آگرہ سے ''زبدۃ الاخبار'' کے نام سے ایک اخبار فارسی میں جاری کیا۔یہ اخبار راجاؤں اور نوابوں کے زیر سرپرستی شائع ہوتا تھا۔جس کی وجہ سے ''زبدۃ الاخبار'' مالی طور پر خوشحال اخبار تھا واجد علی خان محتاط قسم کے ایڈیٹر تھے وہ اخبار میں حکومت کے مخالف خبر سے گریز کرتے تھے ان کی تحریروں کا اھم ماخذ انگریزی اخبارات تھے۔

''ماہ عالم افروز'' جون ۱۸۳۳ء کو کلکتہ سے شائع ہوا جس کے ایڈیٹر مولوی وھاج الدین تھے۔اس اخبار میں معلوماتی تحریروں کے علاوہ انگریز افسروں کی جانب سے مقامی آبادی پر ناروا ظلم و جبر کو نمایاں انداز میں شائع کیا جاتا تھا۔

کلکتہ سے ''سلطان الاخبار'' اگست ۱۸۳۵ء کو رجب علی لکھنوی نے جاری کیا۔شکل وصورت سے یہ اخبار دوسرے ہم عصر فارسی اخبارات سے مختلف نہ تھا لیکن مواد اور انداز تحریر کے اعتبار سے قدرے مختلف تھا اس دور میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف معمولی خبر نشر کرنا بھی بڑے دل گردے کی بات تھی، سلطان الاخبار بڑی بے باکی اور جرات کے ساتھ انگریزوں کی چیرہ دستی کے خلاف کلمہ حق بلند کرتا تھا۔

ایک ہفتہ میں تین بار شائع ہونے والا کلکتہ کا فارسی اخبار ''مہر منیر'' یکم جنوری ۱۸۴۱ء کو محمد علی شاہ نے جاری کیا۔اس اخبار کی ماہانہ قیمت دو روپیہ تھی جبکہ سہ ماہی چندہ پیشگی ادا کرنے سے اس کی قیمت ایک روپیہ ماھانہ ھو جاتی تھی جو اُس وقت کے اخبارات سے خاصی کم تھی مرزا غالب کی قمار بازی کے جرم میں گرفتاری کو اس اخبار نے افسوس ناک واقعہ قرار دیا تھا۔

''سراج الاخبار'' دھلی کے ھفتہ وار فارسی اخبار کا آغاز ۱۸۴۱ء میں ہوا۔یہ آخری مغلیہ حکمران بھادر شاہ ظفر کے دربار کا سرکاری گزٹ تھا۔اس کے صفحات کی تعداد آٹھ ہوتی تھی اخبار کے ابتدائی حصہ میں بادشاہ کے شب و روز کا ذکر ہوتا تھا جب کہ باقی صفحہ پر ملکی اور غیر ملکی خبریں ہوتی تھیں۔۹ نومبر ۱۸۴۴ء کو ممبئی سے ہفتہ وار فارسی اخبار جاری ہوا جس کا نام احسان الاخبار تھا اس اخبار میں دھلی اور قلعہ معلّی کی خبریں اھتمام سے شائع کی جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ کلکتہ مین فارسی کا شائع ہونے والا مشہور و معروف اخبار ''حبل المتین'' ہے یہ اخبار ۱۸۹۳ء میں جاری ہوا۔اس کے ایڈیٹر سید حسن حبل المتین اور مدیر اعلیٰ شیخ یحییٰ کاشی تھے۔یہ فارسی اخبار بڑی آب و تاب کے ساتھ جب کلکتہ سے شائع ہوا تو ھندوستان ہی نہی بلکہ ایران اور دیگر ممالک کے شعراء و ادباء کی نظمیں،غزلیں اور مقالے بھی شائع ہوتے تھے۔کیوں کہ اس وقت ایران میں ناصر الدین شاہ قاجار کی حکومت تھی اور وہ بہت ہی ظالم بادشاہ تھا۔

''حبل المتین'' کی اھمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک غیر ھندوستانی سید حسن ملقب مؤید الاسلام نے اس کی بنا ڈالی اور مسلسل ۳۸ سال تک کلکتہ سے شائع ہوتا رہا۔

احمد کسروی ''تاریخ مشروطہ ایران'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''این مرد مؤید الاسلام کاشانی است کہ قریب ۳۸ سال در کلکتہ روزنامہ حبل المتین را منتشر کرد''

دوسری جگہ احمد کسروی نے روزنامہ ''حبل المتین'' کو معروف و مشہور قرار دیا ہے کہتے ہیں:

''ایں نامہ ھفتگی از ھمہ روزھای آن زمان بزرگتر و بہ نامتری بود و در ھندوستان چاپ شدہ۔''

مختصر افارسی صحافت کی اس خدمت کو جو اس نے انیسوی صدی میں انجام دیا فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

منابع و مآخذ

۱۔کاروان صحافت: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ۱۹۶۴

۲۔تاریخ مشروطہ ایران: احمد کسروی ۱۳۵۲ش

۳۔تاریخ بیداری ایرانیان: ناظم السلام کرمانی ۱۳۴۶ش

۴۔صحافتی زبان: سہیل احمد ۱۹۶۶

۵۔روزنامہ حبل المتین ۱۹۲۵۔۱۹۲۶

ڈاکٹر سرفراز احمد
ڈگری کالج، پونچھ
جموں و کشمیر

مثنوی 'بحرالعرفان' از میرزا اکمل الدین بدخشی ایک تعارف

چکیدہ:۔میرزا کامل کا شمار صوفی، عارف، عالم دین اور کشمیر کے بلند مرتبہ شعراء میں ہوتا ہے۔ان کا تمام کلام عشق و عرفان کے قیمتی موتیوں سے لبریز ہے مثنوی بحرالعرفان کشمیر میں تصوف و عرفان پر لکھی جانے والی مثنویوں میں منفرد مقام کی حامل ہونے کے ساتھ بحر بیکراں کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کے قلمی نسخے کشمیر میں دستیاب ہیں جو تحقیق کے متقاضی ہیں ہنوز ادبی دنیا ان کے کلام سے ناآشنا ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے عہد میں مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹمار ہا تھا، آخری فرمانروا اپنی حکومت کے استحکام کی خاطر جدوجہد کر رہے تھے جس کے اثرات فارسی ادب پر بھی مرتب ہوئے۔

کلیدی الفاظ:۔مثنوی بحرالعرفان، میرزا اکمل الدین بدخشی،نسخہ خطی، کتب خانہ کشمیر یونیورسٹی، نمبر۲۲ تا ۲۵۔

سرزمین کشمیر فارسی زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے اعتبار سے ایک منفرد مقام کی حامل رہی ہے یہ سرزمین فارسی شعراء و ادباء کا مرکز رہی ہے جنھوں نے فارسی ادب کے دامن کو مزید وسعت عطا کی ۔اُنہی شعراء و ادباء کے درمیان نہایت ہی اہم نام میرزا اکمل الدین بیگ خان کامل بدخشی کا بھی ہے۔جنھوں نے تصوف و عرفان سے سرشار مثنوی 'بحرالعرفان' لکھی ہے۔

میرزا اکمل الدین بیگ خان کامل بدخشی کے آباواجداد تاشقند سے ہجرت کر کے کچھ عرصہ بدخشان میں سکونت پذیر رہے ۔اسی مناسبت سے ان کے نام کے ساتھ لفظ بدخشی چسپاں ہے۔میرزا کاملؔ کے جد امجد ملک محمد خان شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں ہندوستان آئے اکبر نے ان کی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۵۹۰ء میں کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔(۱) میرزا کاملؔ کے والد کا نام میرزا عادل بیگ خان تھا۔اور ان کا شمار شاہجہان کے مصاحبان خاص میں ہوتا تھا۔بادشاہ نے انھیں امیر الامراء کا رتبہ بھی عطا کیا تھا۔(۲) میرزا کاملؔ کی ولادت ۱۰۵۴ھ میں کشمیر میں ہوئی۔اُن دنوں شاہجہان کشمیر میں ہی تھے۔بادشاہ نے اس نومولود بچے کا نام کامل رکھا جس کا ذکر میرزا کاملؔ اپنے اشعار میں اس طرح کرتے ہیں:

کاملم شاہ جہان نام نہاد است آنروز   کہ اندرین دارفنا کرد خدا میلادم (۳)

بچپن ہی میں آپ والد کے سایہ سے محروم ہوگئے ۔آپ کی تعلیم و تربیت ان کے مرشد کامل خواجہ حبیب اللہ نوشہری کے زیر سرپرستی میں ہوئی تھی۔ان ہی کی صحبت میں سیر و سلوک کی منازل بھی طے کی۔پچیس سال کی عمر میں آپ کو مرشد کامل نے مسند ارشاد سے نوازا، خلافت کی خلعت پہنائی اور ساتھ ہی اکمل الدین کے لقب سے بھی نوازا۔جیسا کہ میرزا کاملؔ رقم طراز ہیں:

اکمل الدین لقبم کرد ز احسان مرشد   چونکہ بسیار بخاک در او افتادم (۴)

میرزا کاملؔ نے ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی۔

مثنوی بحرالعرفان:

کشمیر میں جہاں شعراء نے نظامی گنجوی کی تقلید میں خمسے لکھے وہیں مولانا روم کی تقلید میں بھی ایک معرکتہ الآرا مثنوی لکھی گی جو بحرالعرفان کے عنوان سے معروف ہے جو میرزا اکمل الدین بدخشی کی افتادطبع کا ثمرہ ہے مولف تاریخ کشیر میرزا اکمل کے مطلق اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"If Persia is proud of its Firdousi, its Hafiz, its Rumi and its Nizami. Kashmir is equally proud of its Shaiq its Ghani, its Sarfi, and its Akmil"5

یہ مثنوی کشمیر میں تصوف وعرفان پر لکھی جانے والی مثنویوں میں سب سے اہم اور ایک عریض بحر کی حیثیت رکھتی ہے۔میرزا کامؔل اس مثنوی کی صراحت خود کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک رات ان کے مرشد خواجہ حبیب اللہ خواب میں ان پر جلوہ گر ہوئے۔ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جس کے بارے میں دریافت کرنے پر مرشد کامل نے انھیں بتایا کہ یہ انکی مثنوی 'بحرالعرفان' ہے۔اوراس کے پانچ مصرعے پڑھے اور چھٹے مصرعے سے میرزا کامؔل نے مثنوی کا آغاز کیا ہے۔جس کا ذکر انہوں نے مثنوی مذکور میں اس طرح سے کیا ہے:

یک شبی چشم من نمی خوابید — بود بیدارو خوابہا میدید
نی شب آنجا نمود ونی روزم — اضطراب و قلق بدو سوزم
پنج مصرء کہ می داشت در اندم — کرد تعلیم ومن ہمی خواندم
ہر چہ او گفت آن بیادم ماند — بحرالعرفان درین نہادم ماند

مثنوی 'بحرالعرفان' کو رشتہ تحریر میں لانے کے لیے انہوں نے اپنے پیشرو عرفانی اساتذہ کی شاہکار تصانیف کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ان میں شیخ عطارؔ کی منطق الطیر ،مولانا جلال الدین رومؔی کی مثنوی معنوی،نظامی گنجوؔی کا پنج گنج،امیر خسرؔو دہلوی اور مولانا جامؔی کی مثنویات کے علاوہ غزلیات حافظ شیرازی شامل ہیں۔ان اساتذہ سخن کا تذکرہ انہوں نے نہایت عقیدت سے اپنے اشعار میں بھی جابجا کیا ہے۔مثنوی مذکور کی ابتدا میں خداوند بزرگوار کی جملہ صفات کو بیان کیا ہے کہ وہی ہر ایک چیز پر قادر ہے کائنات کی ہر چیز اسی کی محتاج ہے اور اسی کے نور سے اس کائنات کا ہر ذرّہ منوّر ہے۔سب تعریفیں اسی کے لائق ہیں۔اس کا ذکر میرزا کامؔل اپنے اشعار میں اس طرح کرتے ہیں:

حمد اللہ حامد و محمود — قوت وفعل خویش را معبود
از جمال و جلال خود مشحون — کرد چون را پدید از بی چون
جلوہ گر ذاتش از صفات آمد — این صفت ہا دلیل ذات آمد
جلوہ ہایش ز صنع ہمدیگر — سوی آن جلوہ گر شدہ رہبر (۶)

حمد باری تعالیٰ کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اوران کی شان مبارک کا تذکرہ کیا ہے کہ وہی اس کائنات میں رنگ وبو کا سبب ہیں۔اگر انکی خلقت مقصود نہ ہوتی تو یہ جہان بھی بے کیف ہوتا۔دراصل ان کا وجود مبارک ہی اس کائنات کی تخلیق کا مظہر ہے اور پیغمبر اسلام تمام جہاں کے لیے باعث فخر اور رحمت ہیں۔اس کو انہوں نے اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

چون جمالش بہ جلوۂ نور افراشت — خلقت زبدۂ رسلؐ انباشت

منبع ہر چہ ہست نورش شد ذات حق ظاہر از ظہورش شد(۷)

مثنوی 'بحرالعرفان' کی اہمیت وافادیت کے بارے میں صاحب مثنوی لکھتے ہیں کہ یہ مثنوی بحرالعرفان جو انہوں نے لکھی ہے صوفیاء اکرام کے راز و نیاز سے متعلق ہے۔اوراس کا ہر ایک لفظ صدف کے ماند ہے اور اسکے معنی موتی کی حیثیت رکھتے ہیں۔جو کوئی بھی ان موتیوں کا طالب ہوگا اسے اس مثنوی کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔جو شخص راہ سلوک پر گامزن ہوکر عشق ومعرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کو پڑھے۔خوش بخت ہوگا وہ شخص جسے یہ موتی حاصل ہونگے۔خود مصنف نے اس دریاے بیکران میں غوطہ زن ہوکر اس راہ کے طالبوں کے لیے موتی پیدا کیے ہیں جس کی طرف انہوں نے یوں اشارہ کیا ہے:

بحرالعرفان کہ اکمل الدین گفت اندر اسرار صوفیہ دُرسفت
لفظ او چون صدف ومعنی دُر این کتابیست بحر و ز آن دُر پر
آنکہ طالب بہ دُر شاہواراست خواندن این کتاب در کار است
ہر کہ باشد سعید با دُر زاد خواہد این دُر بدست او افتاد
شد مصنف غریق این دریا کرد دُر بہر طالبان پیدا(۸)

شرح دین پر کار بند رہنے کے لیے پیر ومرشد کی رہبری ورہنمائی کی اشد ضرورت ہوتی ہے جو ایک سالک کو ہمہ وقت اس رہ کے نشیب وفراز سے روشناس کراتا ہے۔خود پیغمبر اسلامؐ نے شریعت دین پر کار بند رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔جن امور پر وہ خود چلے اور جن سے باز رہنے کی تلقین فرمائی ہے وہی دراصل شریعت ہے۔اور شریعت ہی درحقیقت دین ہے۔اس پر کار بند رہنے سے انسان پر حقیقت کے اسرار ورموز آشکار ہوجاتے ہیں۔دین میں شرح کو روح کی حیثیت حاصل ہے جب انسانی جسم سے روح پرواز کر جاتی ہے تب یہ اپنی اہمیت وافادیت کھو دیتا ہے۔اس کو میرزا کامؔل نے شعر کا جامہ اسطرح سے پہنایا ہے:

شرح را استاد می باید تا ترا ہر چہ ہست بنماید
مصطفیٰؐ این طریق را بنمود آنچہ خود کرد آن بما فرمود
جز شریعت رہ طریقت نیست راہ بالا تر از حقیقت نیست (۹)

میرزا کامؔل علم پر عمل پیرا ہونے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علم حاصل کر لینا ہی کمال نہیں بلکہ اس پر عمل پیرا ہونا باعث کمال ہے۔عمل کے ذریعہ سے روز بروز اس کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔اوراس سے نہ صرف انسان گذشتہ اور آیندہ کے حالات وواقعات سے روشناس ہوتا ہے بلکہ نیک وبد اور حق وناحق میں تمیز بھی پیدا کرتا ہے۔اوراس سے انسانی کمالات کے اعلیٰ مقام کو بھی پہچان لیتا ہے۔بغیر عمل علم اس طوطی کی ماند ہے جو زبان سے الفاظ تو بیان کرسکتی ہے مگر ان کی حقیقت سے بہرا ورنہیں۔عمل کے ساتھ اخلاص کی بھی ضرورت ہے بندگی وریاضت علم کا اعلیٰ درجہ ہے اس کے ذریعہ وہ واصل بحق ہوجاتا ہے جس کی طرف میرزا کامؔل یوں اشارہ کرتے ہیں:

عالم بی عمل بود حیوان حرف او ہیچ رہ ندارد جان
علم آن بہ کہ برتو باشد یار نی کہ بر پشت خربود چون بار
در عمل کوش از رہ اخلاص ہست این علم تو اخص الخاص
بندگی کن کمال علم است این درکتاب قیل وقال است این(۱۰)

مثنوی 'بحرالعرفان' کا اصل موضوع راہ سلوک اور تصوف ہے ۔میرزا کامؔل نے اپنے روحانی تجربات اور احساسات درونی کو منظر عام پر لانے کے لیے شعر کو ہی بہترین ذریعہ اظہار بنایا ہے۔مثنوی مذکور میں راہ سلوک پر چلنے والوں کے خصایص اور احوال، منازل ومقاصد اور مقامات کو بیان کرنے کے ساتھ اس راستہ کی مشکلات کو بھی بیان کیا ہے۔انہوں نے ایک سالک کی عظمت پر بڑی مدلل روشنی ڈالی ہے۔اس مثنوی کو انہوں نے قرآنی آیات سے مزید زینت بخشنے کے ساتھ تصوف وعرفان کے رموز اور عرفانی نکات کو بیان کرنے کے لیے دوسری کتابوں سے بھی نصیحت آموز قصے اور کہانیاں اخذ کی ہیں۔اپنے مقصد کو بیان کرنے میں انہوں نے شیخ عطاؔر اور مولانا رومؔی کی کافی حد تک کامیاب تقلید بھی کی ہے جیسا کہ وہ خود رقم طراز ہیں:

منطق الطیر کہ شیخ عطار شد — در زبان است وقت گفتارشد
عندلیب وہزار زین آواز — کردہ کسب ترنم اندر راز
چون گشاید بخوندنش منقار — مرحبا گو است شیخ دین عطاؔر
مرشد مرشدان جلال الدین — تابد برروان او تحسین
از کتابیکہ دارد آن استاد — سالکان است باخدا ارشاد
معتقد ہر کہ بر کتابش ہست — میدہدفتحباب راہش دست(۱۱)

فقر اور قناعت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ فقر پیغمبروں کا شیوۂ ہے اس کے توسط سے انسان کو قرب خداوندی جیسی عظیم نعمت میسر ہوتی ہے۔جسے یہ دولت حاصل ہوتی ہے وہ جملہ خواہشات کو ترک کر دیتا ہے۔اور قناعت سے آدمی حرص وہوس سے آزاد ہو جاتا ہے۔خالق کائنات بندے سے فقر وفاقہ کے ذریعے طاعت وفرمانبرداری چاہتا ہے نہ کہ فاقہ کشی۔قناعت ایک لازوال وبے رنج دولت ہے اس کے ذریعہ سے انسان متقی اور پرہیزگار ہو جاتا ہے جو خدا تعالیٰ کے نزدیک اہم مقام ہے اس کا ذکر میرزا کامؔل اس طرح سے کرتے ہیں:

فقر را فخرگفت خسرو دین — گر از وی تو نیز فقر گزین
لذّت فقر ہر کہ در یابد — از ہمہ روی خویش بر تابند
تو قناعت مگو گنج است این — دولت بیزوال و رنج است این(۱۲)

ایران وہند کے بہت سے عظیم المرتبت شاعروں نے فقر کو موضوع سخن بنایا ہے۔جن میں سے ایک حافؔظ شیرازی بھی ہیں ۔جن کے نزدیک فقر وقناعت سرمایہ حیات ہے۔وہ اس پر اسقدر قائم تھے کہ انہوں نے بادشاہ وقت کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آہنگی سے اپنا پیغام بھیجا ہے کہ تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ روزی تمھارے ہاتھ میں ہے۔ہر ایک کی روزی مشیت کی طرف سے مقرر ہے۔اس میں کمی اور بیشی ممکن نہیں۔ہمارا شعار فقر ہے جس کو ہم ترک نہیں کرینگے:

ما آبروی فقروقناعت نمی بریم — بابادشہ بگوی کہ روزی مقدراست(۱۳)

میرزا کامؔل نے بھی مثنوی بحرالعرفان میں وہی طرز سخن اپنایا ہے جو مولانا روم نے مثنوی معنوی میں اختیار کیا ہے۔وہ باطنی حقائق کی توضیحات دیتے ہیں پھر نہایت حسین انداز سے ان حقائق کو قاری کے ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں ۔جیسا کہ ذیل کے اشعار میں وہ انسان کے دل کو زرعی زمین سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح ایک کاشتکار زرخیز زمین میں بیج بوتا ہے اور پھر اس سے استفادہ حاصل کرتا ہے اسی طرح تمہاری زرخیز زمین خود تمہارا دل اور جان ہے۔اس میں خدا تعالیٰ کے ذکر کا

بیج بوتے جاؤ۔ جو کچھ زمین میں بویا جاتا ہے وہی کاشتکار کے لیے ثمر آور ہوتا ہے۔ اس کے لیے زمین ہموار ہونی شرط ہے اگر زمین ہموار نہیں تو وہ پھل بھی اچھا نہیں دیگی۔ اس میں جو لگایا جاتا ہے وہی کاٹا جاتا ہے۔ بید کا پیڑ کبھی رطب نہیں دیتا ہے۔ انسان کو تزکیہ نفس اور نفسانی خواہشات کو ترک کرنے کی ضرورت ہے تب جا کر ذکر واذکار نفع بخش ثابت ہونگے۔ ان خیالات کو وہ شعر کا جامہ اس طرح سے پہناتے ہیں:

ہست مزرعہء تو دل با جان تخم ذکرخدا درو ا فشان
آنچہ کارند روید آخر کار بہر کارندۂ خود آرد بار
گر زمین پاک نیست برندہد بید ہر گز رطب ثمر نہ دہد(۱۴)

انسانی عظمت اور فضیلت کا تذکرہ قران کریم میں بھی بیان کیا ہے۔ اور اس عنوان کو بہت سے شاعروں نے اپنے کلام میں نہایت موزوں انداز میں بیان کیا ہے جن میں حافظؔ شیرازی اور علامہ اقبالؒ قابل ذکر ہیں۔ دونوں کا خیال ہے کہ انسانی تخلیق کے ساتھ ہی عشق بھی وجود میں آیا۔ اور یہ باری تعالیٰ کے حسن و جمال کا تقاضا تھا کہ انسان کے قلب میں عشق کا وجود قائم رہے چوں کہ فرشتوں میں اس کی قابلیت نہیں تھی لہٰذا انسان کے خمیر میں اس کو ودیت کر دیا اس کے ساتھ ہی قرآن جیسی عظیم دولت جسے کائنات کے سب مظاہر یعنی زمین و آسمان، پہاڑ وغیرہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انسان کو اس سے نواز کر اسے جملہ مخلوقات میں افضل فرما کر اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میرزا کامؔل لکھتے ہیں کہ ذات مقدس قادر مطلق جو ہر حال میں سب کے قریب ہے نے اس امانت کو آسمان و زمین، فرشتوں، پہاڑوں اور جنات پر پیش کیا انہوں نے اس کو لینے سے انکار کیا۔ مگر اس انسان نے جسے اس کائنات میں اشرف المخلوقات کا شرف حاصل ہے نے قبول کیا، کیونکہ جو کچھ خدا تعالیٰ اس انسان سے چاہتا تھا وہ سب اس کی سرشت میں پیدا فرما کر اسے جملہ تخلیقات میں برگزیدہ بنایا ان خیالات کو وہ شعر کا لباس اسطرح پہناتے ہیں:

ذات پاک مقدس متعال برہمہ او قریب درہمہ حال
داشت چیزی کہ نام امانت داشت خواست خمال بہر آن برداشت
آسمان و زمین بعجز افتاد ملک ودیو نیز سر ننھاد
نفس انسان کہ زبدۂ جود است بہر اظہار عشق مقصود است
آنچہ حق خواست در خمیرش کرد بر گزید از ہمہ کبیرش کرد
برہمہ عرض شد تحمل آن لیک شد فرض حضرت انسان (۱۵)

حافظؔ شیرازی لکھتے ہیں

آسمان بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

عشق ہر ایک منزل کو طے کرنے میں معاون و مددگار ہے۔ عشق سے ہر منزل کی تمام خوبیوں کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور پھر وہی خوبیاں عاشق کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں۔ جسقدر بھی عشق وطلب کی خواہش پیدا ہوگی اسی قدر سالک کے لیے واصل بحق ہونے کا راستہ ہموار ہوگا۔ عشق میں جسقدر شور و جنون پیدا ہوگا اسی قدر حسن اپنے چہرہ سے نقاب کشائی کر کے سالک کو اپنے وصل سے نوازے گا۔ اس کا اظہار میرزا کامؔل اس طرح سے کرتے ہیں:

ہر قدر عشق و حسن پیدا شد راہ سالک بسوی حق واشد

ہر قدر عشق شور می آرد حسن از خویش پردہ بردارد (۱۶)

مولانا رومؒ اپنی معروف مثنوی معنوی میں رقم طراز ہیں۔

ہر چہ گویم عشق از آن والاتر است عشق را خود صد زبان دیگر ست
عشق سنگ بی قرارو بی سکون آنچہ در آرد کل تن را در جنون
مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم
دولت عشق آمد و من دولت پایندہ شدم

مختصر یہ کہ میرزا کامؔل کا جتنا بھی کلام دستیاب ہے وہ سب عرفان و معرفت کے تابناک موتیوں سے لبریز ہے جسقدر بھی ان کے کلام میں قاری غوطہ زن ہوگا۔ اسقدر اسے یہ موتی میسر ہونگے۔

کتابیات:

۱۔میرزا اکمل الدین بدخشی، مقدمہ مثنوی بحرالعرفان جلد اول، زیر شمارہ ۲۲، ص ۲ حکومت جموں و کشمیر۔
۲۔عبدلقادر سروری، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، ص ۱۷۳، سرینگر ۱۹۶۸ء۔
۳۔میرزا اکمل الدین، قصیدہ مخبر الاسرار، ص ۲ نسخہ خطی محکمہ تحقیق و اشاعت حکومت جموں و کشمیر۔
۴۔کشیر مصنف جی۔ایم۔ڈی صوفی نئی دہلی، ۱۹۹۶ء ص ۴۴۷۔
۵۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد ا ص ۱۲، نسخہ خطی محکمہ تحقیق و اشاعت حکومت جموں و کشمیر۔
۶۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد ا ص ۱۳۳ (الف)۔
۷۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد دوم ، ص ۹۰، زیر شمارہ ۲۳، حکومت جموں و کشمیر۔
۸۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد دوم ص ۱۰۸ ب
۹۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد چہارم ص ۱۸۲، زیر شمارہ ۲۵، حکومت جموں و کشمیر۔
۱۰۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد دوم ص ۱۹۰
۱۱۔ایضا ص ۳۴۔۳۵
۱۲۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد دوم ص ۳۵
۱۳۔یوسف حسین خان، حافظ اور اقبال ص ۲۹۸، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، مئی ۱۹۷۶ء۔
۱۴۔میرزا اکمل الدین، مثنوی بحرالعرفان، جلد ا ص ۱۸۲
۱۵۔جلد چہارم ص ۱۸۱ ب
۱۶۔حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب، معارف شمس تبریزی، ص ۳۹۳، کتب خانہ مظہری، کراچی۔

ڈاکٹر خورشید احمد
پی ڈی ایف، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اٹھارہویں صدی کے بعض ہندوں تاریخ نویس

اورنگ زیب کی حکومت کے اواخر میں ہندوؤں میں فارسی ادب وعلوم بہت رواج پا گئے تھے اس سلسلے میں بعض امور کا ذکر کرنا ضروری ہے اولاً یہ کہ ہندوؤں کے فارسی ادب کا مطالعہ کرنے سے تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ایک قوم اس قدر مسلمانوں کے خیالات، تعلیمات اور ان کے طرز بیان سے پوری طرح واقف ہوگئی۔ دوم یہ کہ ہندوؤں کا فارسی ادب اور دیگر معاشرتی حالات بتاتے ہیں کہ مغل بادشاہوں نے ہندو مصنفین کی ہمیشہ قدر افزائی کی اور انہوں نے عام ہندو رعایا کو مسلمانوں کے قریب تر لانے کی کوشش کی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کی عظیم الشان حکومت کئی حصوں میں منقسم ہوگئی مرکزیت کمزور ہوگئی تو صوبجاتی حکومتوں نے آزاد حکومتیں قائم کرلیں تاہم مغلوں کی شان وشوکت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا محمد شاہ کے زمانے میں کسی حد تک عہد زریں کی روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مغلوں کا دربار اب بھی علم وفن کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور تعلیم یافتہ ہندو ملازمین پہلے کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں شاہی ملازمتوں میں موجود تھے۔ اس لئے ہندوؤں نے فارسی ادب کے پیدا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی بلکہ اس عہد (اٹھارہویں صدی) میں پہلے سے زیادہ جوش وجذبے کے ساتھ فارسی ادب پر کام ہوا۔ اس عہد میں جہاں بڑے بڑے نامور ہندو شعرا جیسے آنند رام مخلص، چھبی نرائن شفیق، بیغم بھوپت رائے، کشن چند اخلاص، موہن لعل انیس، منشی ٹیک چند بہار وغیرہ نے شعر کی ہر صنف سخن میں زور آزمائی کی وہیں ہندو نثر نگاروں نے بھی گراں قدر کتابیں لکھی ہیں جن میں لغات، تذکرے، انشائیں اور تواریخ شامل ہیں۔ اس عہد میں ادب کے بہ کثرت پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی کہ اب ایک مرکز کی بجائے تصنیف وتالیف کے بے شمار مراکز پیدا ہوگئے تھے اگر ایک مقام پر مصنف کو مایوسی ہوتی تھی تو وہ دوسرے مراکز کی جانب رخ کر لیتے تھے۔ بہر حال اس عہد میں ہندوؤں نے بہت سی تاریخیں لکھی ہیں ذیل میں بعض تاریخوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ بھوانی داس برہمن:۔ بھوانی داس برہمن عرف پربھا کر پنجاب صوبہ کے جالندھر شہر میں دوآبہ نور محل کے رہنے والے تھے۱۔ محمد شاہ کے عہد میں سپاہ گری کے پیشہ سے جڑ گئے تھے فوج کے اندر انہوں نے بہت سے بہادری کے کارنامے انجام دئے جن کی بنا پر ان کی ترقی ہوگئی۔ انہوں نے ایک تاریخ پر مشتمل کتاب ترتیب دی تھی جس کا نام اقبال نامہ تواریخ اکبری رکھا۔

اقبال نامہ تواریخ اکبری:۔ طبعی عمر پوری ہونے کے بعد فراغت کے دنوں میں بھوانی داس نے ہندوستان کے تاریخی واقعات مرتب کرنا شروع کئے اور اس کتاب کا نام اقبال نامہ تواریخ اکبری رکھا اس کتاب کا سال تکمیل محمد شاہ بادشاہ کے جلوس کا دسواں سال یعنی ۱۷۲۰ء مطابق ۱۱۴۲ھ ہے۔ یہ کتاب تاریخ پر مشتمل ہے۔

خط نستعلیق میں لکھی گئی اس کتاب کے شروع کے اوراق موجود نہیں ہیں اس کے کل اوراق ۱۶۹ ہیں۔ اس کے عنوانات و الفاظ وعبارت مختلفہ خط شنگرف میں ہیں۔ کتاب کے آخر میں ایک قصیدہ بھی ہے جو کامگار خان کی تعریف میں ہے۔ اس کتاب میں مذاہب ہنود اور دیگر سیاسیان ہند کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔(۲)

۲۔کنور پریم چند کشور فراقی:۔کنور پریم چند کشور کا تخلص فراقی تھا یہ کنور آنند کشور کا بیٹا اور راجہ جگل کشور کا پوتا تھا۔جگل کشور نے نواب مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کے یہاں اثر ورسوخ پیدا کرلیا تھا اور کئی برس تک محمد شاہ بادشاہ کے یہاں وکیل کی حیثیت سے مامور رہا۔فراقی نے بڑے گھر میں پرورش پائی تھی اور اس کی تعلیم وتربیت حسب رواج زمانہ اعلیٰ معیار کی ہوئی۔جب جوان ہوا تو مختلف خوبیاں جیسے مہذب، شیریں گفتار، پسندیدہ کردار اور مودت شعار اس کے اندر موجود تھیں۔فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اور برک اللہ برکت سے اصلاح لیتا تھا۔

فراقی نے شاہی لشکر میں ملازمت اختیار کرلی تھی دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ فراقی دوشنبہ ۱۶ شعبان ۱۱۹۸ھ کو شاہی لشکر میں وارد ہوا یہ لشکر شاہ عالم کے ہمرکاب دہلی سے آگرہ کی طرف کوچ کررہا تھا اس سفر میں فراقی کو خیال آیا کہ اس سفر کے روزمرہ کے حالات وواقعات قلم بند کئے جائیں لیکن کسی طرف سے تحریک ومعاونت نہ ہونے کی وجہ سے اس کام میں تاخیر ہوتی گئی۔پھر جب ۱۲ محرم ۱۱۹۹ھ کو بادشاہ نے سید پور میں قیام کیا تو کچھ لوگوں نے فراقی سے روزنامچہ شاہیم تب کرنے کو کہا تو فراقی نے اسی تاریخ سے روزانہ کے واقعات وحالات مرتب کرنا شروع کردئے اور اس کا نام وقایع عالم شاہی رکھا۔

وقایع عالم شاہی:۔یہ کتاب جیسا کہ مذکور ہوا بادشاہ اور اس کی فوج کے روزمرہ کے حالات وواقعات کا مجموعہ ہے۔یہ کتاب دو دفتروں پر مشتمل ہے پہلے دفتر میں بطور تمہید احمد شاہ بادشاہ کے نابینا کئے جانے کے واقعہ سے لیکر عالم گیر ثانی کے واقعات حکومت اور شاہ عالم ثانی کی تخت نشینی تک حالات اجمالاً لکھے ہیں اور اس سلسلے کو ۱۱ محرم ۱۱۹۹ھ پر ختم کردیا ہے۔دوسرا دفتر ۱۲ محرم ۱۱۹۹ھ سے شروع کیا ہے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۱۹۹ھ پر ختم کیا ہے اور اس طرح ایک دن کم دو مہینے کے شاہی لشکر کے روزمرہ کے واقعات حالات بیان کئے اور آنے والے مورخوں کو متعدد پوست کندہ حالات کے مطالعہ کا موقعہ مل سکا۔اس روزنامچہ کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شاہی روزنامچوں کے برخلاف اس کو شاہی حکم سے یا بادشاہ کو خوش کرنے کی غرض سے مرتب کیا گیا تھا اس لئے اس کا انداز بیان بے باک اور طرز بیان بڑی حد تک صاف وسادہ ہے۔واقعات کے بیان میں بھی کسی شخص یا فریق کی بیجا حمایت نظر نہیں آتی ہے حتی کہ شاہ عالم پر بھی جس کا فراقی خاصہ معتقد نظر آتا ہے آزادی کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔(۳)

۳۔جانکی رام:۔جانکی رام ایک تاریخ نویس کی حیثیت سے معروف ہیں۔انہوں نے خاندان تیموریہ ومغلیہ کی تاریخ تفصیل کے ساتھ لکھی ہے جس کا نام تاریخ فہرست تیموریہ رکھا۔(۴)

تاریخ فہرست خاندان تیموریہ:۔جیسا کہ مذکور ہوا یہ ایک تاریخ پر مشتمل کتاب ہے۔اس کتاب کا سال تکمیل ۱۷۸۸ء مطابق ۱۲۰۳ھ ہے۔(۵) اس میں تیموریہ خاندان کے افراد کے بارے میں بتایا گیا ہے۔اس خاندان میں جو جو بادشاہ یا وزیر ہوئے ہیں ان کے حالات اور واقعات کا تفصیلاً ذکر ہے۔تیموری بادشاہوں کی جنگیں اور ان کی فتوحات اور ان جنگوں میں پیش آنے والے دیگر واقعات کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ تیموری خاندان کی اصل اور اس کی شاخوں کے بارے میں بھی اہم معلومات دی ہیں۔یہ کتاب امیر تیمور یہ گورگانی صاحبقرانی کے ذکر سے شروع ہوکر شاہ عالم بادشاہ کے ذکر پر ختم ہوتی ہے۔خاندان تیموریہ ومغلیہ کے بارے میں جاننے کے لئے یہ ایک اہم ماخذ ہے۔

۴۔کاشی راج شوراؤ پنڈت:۔کاشی راج شوراؤ پنڈت کا شمار مراٹھا سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے سدا شوراؤ کی ملازمت اختیار کی تھی۔پانی پت کے مقام پر برپا ہوئی تیسری جنگ کے چشم دید تھے۔نواب شجاع الدولہ کی مخبری کا کام ان کے سپرد تھا اور بہت سے اہم کام انجام دیے تھے جو جنگ شروع ہونے سے پہلے ضروری تھے۔کاشی راج نے اس جنگ کے حالات وواقعات کو ایک

کتاب میں جمع کیا جس کا نام احوال جنگ پانی پت رکھا۔

احوال جنگ پانی پت:۔ یہ کتاب پانی پت میں واقع ہوئی جنگ کے احوال پر مشتمل ہے۔ یہ جنگ احمد شاہ درانی اور بہاو مرہٹہ کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ مصنف نے نواب شجاع الدولہ کے حکم سے اس کو تصنیف کیا اس کا سال تصنیف ۱۷۸۰ء ہے۔ یہ جنگ پانی پت کے مقام پر ہونے والی تیسری جنگ ہے۔ یہ جنگ ۱۷۶۱ء سے لے کر ۱۷۸۰ء تک برپا ہوئی۔(۶)

۵۔کیول رام:۔ کیول رام کا تعلق دہلی کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں کا سنہ سے تھا۔ ان کے والد کا نام رگھناتھ اگروال تھا۔(۷) کیول رام نے مغل سلطنت کے بارے معلومات یکجا کیں اور بادشاہ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک کے ہندو اور مسلم امراء کے بارے میں تاریخ پر مشتمل ایک کتاب تحریر کی جس کا نام تذکرۃ الامرا رکھا۔

تذکرۃ الامرا:۔ اس کتاب کا سال تکمیل ۱۷۸۲ء ہے۔ اس کے اندر ہندوستان کے امرا کے احوال بیان کئے گئے ہیں۔ یہ امرا اکبر بادشاہ، جہاں گیر، شاہ جہاں اور عالم گیر کے درباروں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب مسلم امرا کے احوال کے بیان میں ہے اور دوسرا باب ہندو امرا کے احوال کے بیان میں ہے اور ان میں سے ہر باب دو فصلوں پر مشتمل ہے(۸)۔ اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ کتاب شاہی روزنامچوں اور وقایع ناموں سے ترتیب دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ جن کتب تواریخ سے استفادہ کیا گیا ہے وہ تاریخ اکبر نامہ، تاریخ اقبال نامہ، توزک جہاں گیری، تاریخ باشاہ نامہ، عالم گیر نامہ اور مآثیر عالم گیری وغیرہ ہیں۔(۹)

۶۔خوشحال چند:۔ خوشحال چند کا تعلق کایستھ قوم سے تھا۔ اس کے والد کا نام جیون رام تھا۔ خوشحال چند اورنگ زیب بادشاہ کے عہد میں مال گزاری کے اہم عہدے پر فائز تھے۔(۱۰) شاہ عالم بہادر شاہ اول کا زمانہ اس کے عروج کا زمانہ ہے اور پھر مغل عہد میں بھی یہی عہدہ اس کو دیا گیا۔ نادر شاہ نے جب دہلی پر حملہ کر کے قتل و غارت بپا کیا تو اس کے چشم دید خوشحال چند نے اپنی آنکھوں دیکھے واقعات و حالات کو قلم بند کیا جس کا نام تاریخ محمد شاہی رکھا۔ خوشحال چند کی وفات ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں ہوئی۔

تاریخ محمد شاہی:۔ یہ کتاب تاریخ پر مشتمل ہے جو ابتدا سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک کی تاریخ ہے اس میں ہندوستان کے بارے میں اہم معلومات درج ہیں۔ اس تاریخ محمد شاہی کا دوسرا نام نادر الزمانی بھی ہے۔ یہ کتاب دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالے کا نام مجمع الاخبار ہے اور وہ دو کیفیتوں کو شامل ہے۔ دوسرا مقالہ زبدۃ الاخبار کے نام سے ہے اور وہ دو مطلعوں پر مشتمل ہے۔(۱۱)

۷۔شو پرشاد:۔ شو پرشاد کا تعلق ریاست رام پور سے تھا اور یہ نواب فیض اللہ خان کے ملازمین میں سے تھے سرکاری مہموں کے اسلوب اور سوال و جواب کے کاموں میں مصروف رہتے تھے انہوں نے تاریخ پر مشتمل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام تاریخ فرح بخش ہے۔(۱۲)

تاریخ فرح بخش:۔ اس کتاب کا سال تکمیل ۱۷۶۷ء ہے(۱۳)۔ اس تاریخ میں افغانوں کی ہندوستان میں آمد کا ذکر ہے اور رام پور اور اس کے آس پاس کے شہروں کے نوابوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ریاست رام پور کی تعریف، کوسی ندی کی تعریف اور نواب فیض اللہ خان کی تعریف بھی کی گئی ہے(۱۴)۔ ریاست رام پور اور وہاں کے نواب کے بارے میں یہ ایک نفع بخش کتاب ہے۔ اس کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔

۸۔مترسین:۔ منشی مترسین مغل عہد میں سرکاری ملازم تھے محمد شاہ بادشاہ کا عہد ان کا زمانہ ہے ان کی عمر اسی سال تھی اور کہٹر صوبہ کے توپخانہ میں بریلی کے نزدیک وزیر آصف الدولہ کے ماتحت ملازم تھے اور سولہ سال تک ملازمت کرتے رہے۔(مدت عرصہ سال شانزدہ در انقضاست کہ عمل وزیر عالم آصف الملک آصف الدولہ جنت آرامگاہ در توپخانہ متعینہ صوبہ کٹہر در بریلی۔۔۔۔ سرشتہ علاقہ

تصادت منشی مترسین نام قوم کاہستھ مستجمع شرایف بزرگی ونسانی اقامت پذیر بوداز اقصی محاسن فطرت عالی کہ نیکان در ہر چہ بیند نیک بیند برحال حیرت اشتمال راقم سطور پنڈت شنبھو ناتھ چودھری ولد راجہ نرائن داس پنڈت نہایت بذل اخلاق واعطاء اشفاق فرمودی روزی از روزہای سعادت بخش فرمود)(۱۵)۔ گونا گوں خوبیوں کے جامع تھے اخلاق وفطرت کے اعتبار سے بھی اچھے انسان تھے ہر کسی سے خیر خواہی کے ساتھ ملتے تھے۔انہوں نے اپنی یادداشت تحریر کی جس کا نام دورنامہ رکھا۔

دورنامہ:۔مترسین نے ایک قریبی دوست شنبھو ناتھ چودھری ولد راجہ نرائن داس کو اپنی یاد داشتوں پر مشتمل خطوط سونپ دئے جو شنبھو ناتھ نے ترتیب دیئے اور اس کا نام دورنامہ رکھا اس کا سال تکمیل ۱۸۱۲ء مطابق ۱۲۲۷ھ ہے(۱۶)۔ یہ مترسین کا اسی سالانہ تجربہ اور تاریخ ہے اس کے اندر محمد شاہ بادشاہ کی تاریخ ہے اور ہندوستان کے بارے میں تاریخی معلومات درج ہیں اس کے علاوہ روہیلہ علی محمد خان ونواب نجیب خان وحافظ دوندی خان بہرام وغیرہ کی تاریخ بھی ہے۔محمد شاہ کی فتوحات شجاع الدولہ کے عہد میں کا بھی ذکر ہے۔المختصر احمد شاہ بادشاہ غازی وعزیز الدین عالم گیر ثانی وشاہ عالم بادشاہ کی خلافت کے احوال شہزادگی کی ابتدا سے وقت تحریر تک درج ہیں۔(۱۷)

حوالہ جات۔

۱۔بھوانی داس برہمن پربھاکر،اقبال نامہ تواریخ اکبری،مخطوطہ نمبر۳۲۔۱۰۱حبیب گنج کلکشن مولانا آزاد لائبریری،اے۔ایم۔یو۔علیگڑہ،ورق ۱۷(الف)

۲۔ایضاً

۳۔کنور پریم کشور،وقائع عالم شاہی،بہ تصحیح وتحشیہ امتیاز علی خان عرشی،ہندوستان پریس رامپور،۱۹۴۹ء،ص۱۹۔۲۰

۴۔جانکی رام،فہرست خاندان تیموریہ،مخطوطہ نمبر۳۶۸۔۱۳۸،عبدالسلام کلکشن،مولانا آزاد لائبریری،اے۔ایم۔یو۔علیگڑہ،ورق ۱(ب)۔

۵۔ایضاً۔

۶۔نبی ہادی،ہسٹری آف انڈو پرشین لٹریچر،ایران کلچر ہاؤس،نئی دلی،۲۰۰۱ء،ص۵۲۷۔

۷۔نظامی بدایونی،قاموس المشاہیر،جلد دوم،نظامی پریس بدایوں،۱۹۲۶ء،ص۱۶۱۔

۸۔کیول رام،تذکرۃ الامرا،مخطوطہ نمبر۳۲۔۵۷،حبیب گنج کلکشن،مولانا آزاد لائبریری،اے۔ایم۔یو۔علیگڑہ،ورق۲(ب)

۹۔ایضاً،ورق۳(الف)

۱۰۔نظامی بدایونی،قاموس المشاہیر،جلد اول،نظامی پریس بدایوں،۱۹۲۴ء،ص۲۳۰۔

۱۱۔خوشحال چند،تاریخ محمد شاہی،مخطوطہ نمبر۳۴۳۔۱۱۳،عبدالسلام کلکشن،مولانا آزاد لائبریری،اے۔ایم۔یو۔علیگڑہ،ورق ۷(الف)۔۸ (الف)۔

۱۲۔شو پرشاد،تاریخ فرح بخش،مخطوطہ نمبر۱۷۲۔۳۸ عبدالسلام کلکشن،مولانا آزاد لائبریری،اے۔ایم۔یو۔علیگڑہ،ورق ۷(الف)۔۸ (الف)۔

۱۳۔ایضاً،ورق۸(الف)۔

۱۴۔ایضاً،ورق۲(الف)۔۷(ب)۔

۱۵۔منشی مترسین،دورنامہ،مخطوطہ نمبر۲۰۲۔۶۸ عبدالسلام کلکشن،مولانا آزاد لائبریری،اے۔ایم۔یو۔علیگڑہ،ورق ۱(الف)۔

۱۶۔ایضاً،ورق۳(الف)۔(ب)۔

۱۷۔ایضاً،ورق۳(الف)۔

ڈاکٹر یاسر عباس
استاد، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

نگاہی بہ قصیدہ ای ''درتوحید''۔۔امیر خسرو دہلوی

بعدِ اشاعت اسلام فارسی شاعری کا ارتقاء عربی زبان کے سایے میں ہونے لگا۔اس کے باوجود اہل فارس نے نئی نئی راہیں نکالتے ہوئے عربی زبان کے غلبے کو کہیں کم اور کہیں ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ رباعی، مثنوی اور تاریخ گوئی جیسی کتنی ہی اصناف سخن اہل فارس نے عربی کے اثرات سے بچ کر ایجاد کیں۔لیکن قصیدہ اور غزل دو ایسی اصناف ہیں جن پر عربی زبان کے کچھ نہ کچھ اثرات آج بھی باقی ہیں۔قصیدہ کہ جس کو عربی زبان ملی ہی تھی فارسی زبان کا بھی طرہ امتیاز رہا۔دور مشروطیت سے قبل تک فارسی زبان پر صنف قصیدہ ہی کا غلبہ رہا۔جس کی خاص وجہ ممدوحین سے مال وزر کا حاصل ہونا تھا۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ قصیدہ نگاروں نے صرف امیروں، وزیروں، بادشاہوں یا نوابوں کی مدح ہی نہیں کی بلکہ عشقِ خدا، رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی مدح سرائی بھی صنف قصیدہ میں خوب کی ہے۔قصیدہ کا شکوہ اس بات کا متقاضی رہتا ہے کہ وہ دیرینہ تلمیحات کے سایے میں آگے بڑھتا ہے۔اس لئے قصائد کے ذیل میں حمد، نعت اور منقبت بھی خوب تحریر ہوئی ہیں۔

یہ مضمون حمدیہ قصاید میں تلمیحات کے لوازمات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا گیا ہے۔جس میں خسرو نے بالکل اسلامی اور اچھوتی تلمیحات کا استعمال کر کے مضمون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔امیر خسرو ہی وہ شاعر ہے جس نے ہندوستان میں عام مقبولیت کے ساتھ ساتھ ایرانیوں سے بھی دادِ سخن حاصل کی ہے۔ورنہ ایرانیوں نے کسی غیر ایرانی فارسی شاعر پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی کہ خسرو کو نصیب ہوئی۔اور کچھ شعراء نے آپ کی زمینوں میں طبع آزمائی بھی کی ہے۔ایرانی شعراء کے علاوہ ایرانی محققین نے بھی خسرو پر کام کیا ہے۔ڈاکٹر سعید نفیسی نے ''دیوان کامل امیر خسرو دہلوی'' کے نام سے آپ کا کلام ترتیب دیا ہے جسمیں غزلیات، رباعیات، قطعات کے علاوہ ۱۹ قصائد بھی شامل ہیں۔(۱) انہیں قصائد میں سب سے پہلا قصیدہ ''درتوحید'' ہے اس مضمون کو لکھنے میں اسی قصیدہ سے مدد لی گئی ہے۔

اس قصیدہ کی ابتداء زبان کی اہمیت، افادیت وضرورت کو بیان کرتے ہوئے کی گئی ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ ذات وحدہ لاشریک نے انسان کو احسن تقویم پر پیدا کیا ہے، زبان جیسی بیش قیمتی نعمت عطا کی ہے جس سے انسان کلام کرتا ہے خطاب کرتا ہے یہی شکر گوئی اور پاس گزاری کا ذریعہ ہے۔اس شعر کا مفہوم بہت حد تک حضرت علیؑ کے قول کو بیان کرتا ہے۔ **قال علی علیہ السلام**: '' **تَکَلَّمُوا تُعرَفُوا فَاِنَّ المَرءَ مَخبُوءٌ تَحتَ لِسَانِہِ** ''، حضرت فرماتے ہیں: گفتگو کرو تا کہ پہچانے جاؤ۔بے شک انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہے۔(۲) یعنی انسان کی پہچان اس کی زبان ہے جیسی وہ گفتگو کرے گا ویسی ہی شہرت پائے گا۔اسی قول کا بہترین منظوم ترجمہ شیخ سعدیؒ کی گلستان کے پہلے باب کی حکایت نمبر ۳ کے ذیل میں درج ہے ؎

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد(۳)

اسی مضمون کو اردو میں جوش ملیح آبادی نے بھی خوب نبھایا ہے ؎

آدمی بزم میں دم گفتار
جب کوئی حرف لب پہ لاتا ہے
درحقیقت وہ اپنے ہی حق میں
کچھ نہ کچھ فیصلہ سناتا ہے

ملاحظہ کیجئے خسرو نے کس خوبصورت سے اس مفہوم کو نظم کیا ہے ؎

زبان کہ بر در معنی کلید گفتار ست
ز بہر شکر و سپاس یکی جہاندار ست

معرفت الٰہی اتنی آسان شئ نہیں بلکہ انسان جتنی کدو کاوش کر لے حق معرفت ادا نہیں کر سکتا۔ جتنی زیادہ تلاش کی جائے اتنا ہی معرفت کا سمندر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ نہج البلاغہ، کلامت قصار میں حضرت علی علیہ السلام بیان فرماتے ہیں

"**مَن عَرَفَ نَفسَهُ فَقَد عَرَفَ رَبَّهُ**"۔ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ (۴)

معرفت الٰہی سے پہلے معرفت نفس لازمی ہے۔ جب انسان اپنے نفس کو پہچان لے گا تو خدا کی تلاش و جستجو می مزہ آئے گا وگرنہ معرفت الٰہی کا حصول اس قدر دشوار گزار ہو جائے گا کہ اس کے مقابلے پہاڑ کھودنا قدرت آسان نظر آئے گا۔ ؎

ز گنج معرفتش کی بسیر یابد کس
چو بر خرد ہمہ درہای راز مسمار ست

خیال می رود و قفل معرفت سخت نسیم
می وزد و حفر کوہ دشوار ست

خسرو کے مطابق حکیم کا یہ کہنا کہ خدا کو عقل کے ذریعہ پہچانا، سراسر ایک حماقت ہے کیونکہ خدا وہ ذات ہے جو عقل میں سماتی نہیں۔ کیونکہ عقل مخلوق ہے اور خدا خالق، تو خالق مخلوق میں کس طرح سما سکتا ہے۔ یعنی خداوند متعال کی مکمل بعرفت حاصل کرنا عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس مرحلہ میں دنیا کے بڑے بڑے خردمند و دانشور الجھے ہوئے نظر آتے ہیں، اگر بوعلی سینا اس کی ذات کا اقرار کرتے ہیں تو ارسطو منکر نظر آتا ہے۔ ؎

حکیم گفت شناسم بعقل یزدان را
زہی کمال حماقت وہ این چہ گفتار ست
ازین چہ سود و زیان در کمال حکمت او
کہ بو علی مُقِرُّ و ارسطو بانکار ست

حضرت جعفر طیارؑ، حضرت علیؑ کے برادر حقیقی تھے جن کے دونوں بازو جنگ موتہ میں شہید ہو گئے تھے تو حضور اکرمؐ نے آپ کے متعلق ارشاد فرمایا تھا، کہ "خدا نے جعفر کے دونوں بازوؤں کے عوض دو پر عطا کئے ہیں جن کے سہارے وہ جنت الفردوس میں ملائکہ کے ساتھ پرواز کرتے رہیں گے"۔ اسی واقعہ کے بعد سے حضرت جعفر بن ابی طالب کو جعفر طیار کہا جانے لگا۔ اور آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ خسرو نے اسی واقعہ کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے جسے اس سے قبل، نہ بعد میں کسی بھی فارسی شاعر نے بطور تلمیح موزوں نہیں کیا ہے۔ خسرو کہتے ہیں ؎

بکنہ حق نرسد عارف ارچہ داننده ست
بر آسمان نپرد جعفر ارچہ طیار ست

امیر خسرو بہ یک وقت بہترین شاعر، ماہر موسیقی داں ہونے کے ساتھ ساتھ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔لہذا علم نجوم کے اسرار ورموز سے مضمون میں رونق پیدا کی ہے۔اور اپنی فکر کو نجوم کی اصطلاحوں سے واضح کیا ہے۔خسرو کہتے ہیں ۹ افلاک اور اٹھارہ ہزار عالم ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔اگر دنیا کو فنا آنے لگے تو ان ہزاروں عالم میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔یہ آسمان جو انگوٹھی کے نگینہ کی مانند گراں ہے قیمتی ہے۔لیکن خدا کی رحمت کے بغیر ان سب کی کوئی وقعت واہمیت نہیں ہے۔خدا نے ایک مادہ سے تمام جواہر کو پیدا کیا ہے۔

مبین کہ نہ فلک و عالم است ہیجدہ ہزار
کہ نیست یک اثر ار صد ہزار آثار ست
مگو کہ ہستر انگشترین چرخ گران
کہ در اصابۂ رحمانش نی چو بی بار ست
پدید کرد جواہر مجرد از مادہ
کہ در خزانۂ ملکش مسلک اظہار ست

خدا نے انسان کو عناصر اربعہ سے تخلیق کیا ہے اور یہ چاروں عناصر ایک دوسرے کی ضد ہیں جن کا ایک جگہ جمع ہونا محال ہے لیکن خدا کی ذات لائق تعریف ہے کہ اس نے ان چاروں اضداد کو یکجا کر کے اپنی بہترین خلقت انسان پیدا کیا اور قرآن کریم کے تیسویں پارے کے سورۂ تین میں اس کا تذکرہ کیا۔''انا خلقنا الانسان فی احسن تقویم''۔ہم نے انسان کو بہترین خلقت پر پیدا کیا۔(۵) خسرو اسی کی اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ جب خدا نے ہم کو مٹی سے خلق کیا ہے تو کیوں نہ خاکی جبین کو خاک پر رکھکر اس کی عظمت کو سجدہ کیا جائے۔خدا نے جو جسم انسانی خلق کیا ہے اس میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے جو سانس کی آماجگاہ ہے سینہ اس کی سپر ہے عقل وزیر ہے تو جان سالار لشکر ہے۔

چرا بخاک نسائیم پیش او رخ وچشم
کہ او ز خاک مرا دادہ چشم و رخسار ست
ز آب وگل تن مردم چو قلعہ ای آرا ست
بشکل تنگ و بمعنی جہان اسرار ست
خزینہ دار نفائس بسینہ دل را ساخت
خرد وزیر شد و جان سپاہ سالار ست

حضرت عیسی روح اللہ سے تین سو سال قبل معرفت الٰہی حاصل کرنے والے سات وزراء جنہیں قرآن کریم نے اصحاب کہف کے نام سے یاد کیا ہے اور با قاعدہ ایک سورہ کا نام انہیں سے منسوب ہے کہ جس میں ان وزراء کے تفصیلی حالات مندرج ہیں۔یہ وزراء معرفت الٰہی حاصل ہونے کے بعد اپنے جابر بادشاہ دقیانوس (جو خود کو خدا کہلاتا تھا) کو چھوڑ کر ایک غار میں گوشہ نشین ہو گئے۔ان کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جو ان کے ساتھ آج بھی اس غار میں محو خواب ہے۔(۶) خسرو نے اس سگ غار کو بطور تلمیح استعمال کیا ہے۔

چہ رمزہاست تعالی اللہ این بملک قدیم
کہ بیمُست سگ و سگ مصاحب غار ست

موذن اسلام حضرت بلال حبشی جن کے لئے تاریخ اسلام لکھتی ہے کہ آپ حروف کی ادائیگی درست طور پر نہیں کر پاتے تھے ''ش'' کو ''س'' پڑھتے تھے۔ حضور سے کوئی حسبی، نسبی یا کوئی دیگر خاص رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی جانثاری، فداکاری، ایثار، محبت، مودت، ولا، جذبۂ ایمان کی بدولت اسلام کے اولین موذن قرار پائے اور ایمان کے حسن پر خالِ سیاہ کی مانند جلوہ گر ہو گئے۔ جن پر اہل اسلام فخر ومباہات کرتے رہیں گے۔ لیکن عرب کی سرزمیں کا مشہور زمانہ مغرور ابوجہل حضور پاک کا چچا ہو کر بھی قابل لعنت وملامت ہے۔

شدہ بلال سیہ بر جمال ایمان خال
ز کفر عز عرب عم مصطفیٰ خوار است
حرارتی بزبان کرد در رہش منصور
کزان حرارت خود جلوہ کردہ پروار است

ابتدائے تبلیغ اسلام میں کفار مکہ آپ کی تضحیک کرتے، ناسزا کہتے، ایذا پہنچاتے، طعنہ دیتے۔ خسرو نے انہیں طعنہ زنوں کو ''روافض'' کہا ہے اور قابل لعنت قرار دیا ہے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ حضور اکرم کو ایذا پہنچانے والے گمراہ ہیں۔ ان کو جو کچھ خسرو نے کہا ہے وہ خسرو ہی کے زبانی بیان کرنا زیادہ مناسب تر ہے۔

بزد بزخم گہش ران احمد را
کہ طعنشان پس از آن سرزنش بخمار ست
ہم از ویست روافض نشانہ لعنت
کہ سگ زنست پریشان سرانہ معمار ست

بوتراب عیار کا مزہ ہی الگ ہے اکثر خسرو نے حضرت علی کی مدح کی ہے اور آپ کی محبت کو مئے حقیقی کہا ہے۔ ظاہر ہے پیرو و پرشد نظام الدین اولیاء کے خاص شاگرد ہیں۔

ہمون فکند بدلہا ز بوتراب عیار
کہ بر سر مردن بفر سیار ست

اسلامی نقطۂ نگاہ سے خداوند عالم نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے متعین کئے ہیں جو اس کی ہر نقل وحرکت پر نگاہ رکھتے ہیں اور اس کے اعمال کو تحریر کرتے ہیں جس کے سلسلے میں حضرت علیؑ نے کلمات قصار (نہج البلاغہ) میں فرمایا ہے کہ اِنَّ مَعَ کُلِّ اِنسانٍ مَلَکَین : ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے رہتے ہیں۔ (۷) جنہیں کرام الکاتبین کہا جاتا ہے۔ خسرو انہیں ملائک کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ میری ہر نقل وحرکت پر نگاہ رکھنے والے فرشتوں سے کہو کہ اے فرشتوں میری خطائیں نہ لکھو۔

دو کاتب از پی جرم قلم چو جعد کنند
کہ مو بمو ز پریشانیم در اقرار ست
فرشتہ گو سر کلک خود سیہ نکند
ز حرف من کہ از ادیو ہم در آزار ست

خسرو عاجزانہ طور پر کہتے ہیں کہ تمام خلق ے بدلے مجھے دوزخ کے حوالے کردو چونکہ کوئی بھی شخص مجھ جیسا ستمکار نہیں میرے بدلے تمام دوزخیوں کو رہا کردو۔اس اعتراف کے بعد خسرو کے ان کا یہ عالم ہیکہ اگر فضل خدا شامل حال ہوتو اس سب کے باوجود میں رہا ہوجاؤنگا۔اگر خدا چاہے تو اپنی عفوودرگذر کے ایک ہی قطرے سے میرے سیاہ اعمال نامے کو دھوکر مجھے معاف کرسکتا ہے۔

مرا ببر بدل جملہ خلق در دوزخ
کہ ہیچ دوزخیی نی چو من ستمکار ست
بدوزخی کہ روم من رہا فکن دگری
کہ جملہ دوزخیان را ز چون منی عار ست
اگر تو فضل نمایی پلید و پاک یکیست
ز فیض باراں خس بہرہ ور چو ازہار ست
ز بہر شستن لوح ہمہ ستمکاران
ز عین عفو تو یک قطرہ نیز بسیار ست

خسرو نے اس قصیدہ میں جومضامین باندھے ہیں وہ قابل دید ہیں اس کے علاوہ بھی خسرو کے دیگر قصائد اسی طرح کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں۔جن کا مطالعہ ادب نواز حضرات کے لئے نہایت نفع بخش ہوگا۔

منابع ومأ خذ:

۱۔ دیوان کامل امیر خسرو۔سعید نفیسی باہمت وکوشش۔م،درویش۔چاپخانہ سعدی،ناشر:سازمان،انتشارات جاویدان،چاپ دوم:اسفندماہ ۱۳۶۱

۲۔ نہج البلاغہ،کلمات قصار۔ص۳۹۲ ۔تالیف: علامہ السید الشریف الرضی،مترجم:علامہ سید ذیشان حیدر جوادی،ناشر:تنظیم المکاتب۔گولہ گنج لکھنو۔۱۸یوپی۔ایڈیشن۳،نومبر۲۰۰۸ء،مطبوعہ اے۔بی۔سی۔آفسیٹ پریس۔دہلی

۳۔گلستان سعدی ۔ باب اول حکایت۳ ص۲۰ ،سعدی شیرازی،ناشر:مکتبہ بلال دیوبند

۴۔کلمات قصار، نہج البلاغہ۔ تالیف: علامہ السید الشریف الرضی، مترجم : علامہ سید ذیشان حیدر جوادی، ناشر:تنظیم المکاتب ۔گولہ گنج لکھنو۔۱۸یوپی۔ایڈیشن۳،نومبر۲۰۰۸ء،مطبوعہ اے۔بی۔سی۔آفسیٹ پریس۔دہلی

۵۔سورۂ تین آیت۴،پ۳۰۔قرآن کریم

۶۔سورۂ کہف، قرآن کریم

۷۔کلمات قصار،نہج البلاغہ۔ص۰۰ے۔تالیف: علامہ السید الشریف الرضی،مترجم:علامہ سید ذیشان حیدر جوادی، ناشر:تنظیم المکاتب۔گولہ گنج لکھنو۔۱۸یوپی۔ایڈیشن۳،نومبر۲۰۰۸ء،مطبوعہ اے۔بی۔سی۔آفسیٹ پریس۔دہلی

لطیف احمد سلمانی
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

''ہدایت المخلصین'' کا اجمالی تعارف

کشمیر کا خطۂ جنت عہد وسطی میں جن روحانی شخصیتوں کی دینی تبلیغ کی بدولت قلعہ اسلام اور ایران صغیر بن گیا تھا ان میں عالی مرتبت سادات کی اولیت مسلم ہے۔ جو خالصتاً اسلام کی ترویج واشاعت کا کام آگے بڑھانے کی غرض سے حضرت سید عبدالرحمٰن بلبل شاہ ترکستانیؒ اور حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کی سربراہی میں وارد کشمیر ہوئے تھے اور جو عموماً وسط ایشیا یا ایران کے مختلف علاقوں سے چل کر یہاں آئے تھے۔ لیکن چودھویں صدی عیسوی کے دوران اہل علم و ہنر پر مشتمل دو بڑے کاروان ساتھ لے کر یہاں آنے والے ان پیشروؤں کے کارہائے نمایاں کا ذکر سن کر بعد کی تین صدیوں میں بھی یہاں باہر سے آنے والے ارباب علم و فضل کی نہ صرف یہ کہ خوب پذیرائی ہوتی رہی ہے بلکہ حضرت نورالدین کشمیریؒ اور حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ سے براہ راست فیضان پانے کی غرض سے پیر پنچال کے اس پار سکونت پذیر لوگ اب دوسرے قسم کے مقاصد لیکر یہاں پہنچنے لگتے ہیں۔ مثلاً شیخ اول کی خدمت میں کشتواڑ کے راجپوت خاندان کا زیا سنگ آکر مشرف بہ اسلام ہوتا ہے اور زین الدین ولیؒ بن کر عیش مقام کے گرد و نواح کو ایمان وعرفان کا فیضان پہنچاتا ہے تاکہ جنوبی کشمیر کے دور افتادہ دیہات میں تازہ وارد اسلام کی ضیاء باریوں سے فیضیاب ہوسکیں۔ اسی طرح کئی صدیوں بعد گجرات کے سادات علوی کے چشم و چراغ میر سید بابا حیدر تیلہ مولی اپنے آپ کو معاصر کشمیر کے آفتاب روحانیت حضرت شیخ حمزہؒ کشمیریؒ کی خدمت میں پہنچا کر اپنے ایمان وعرفان کو تقویت بہم پہنچاتے ہیں۔ اور شمالی کشمیر کے دور افتادہ دیہات کو فیضان اسلامی پہنچانے کے لئے اپنے مرشد کی ہدایت پر لار پرگنہ تیلہ مولہ گاؤں میں بود و باش اختیار کرتے ہیں۔

گجرات کے علوی سادات کے گھر میں ۸۹۱ھ کے دوران ایک ایسا حسین اور سعادت مند بچہ متولد ہوا جس کے روشن آثار دیکھ کر اپنی خاندان کی روایت کو ملحوظ نظر رکھ کر اس کے مستقبل کے ساتھ اچھا توقع رکھکر اس کا نام حیدر رکھا گیا۔

سید بابا حیدر تیلہ مولیؒ نے ایک سو دس سال کی عمر پائی تھی (۱) اور اس عمر دراز کا بیشتر حصہ انہوں نے انتہائی فقر واستغنا میں گذارا تھا۔ یہ طرز زندگی بابا حیدر نے اپنی رضامندی سے اختیار کیا تھا۔ فقر وفاقہ میں شکوہ وشکایت نہ کرنے کی روشن اختیار کرنے والے اس روحانی بزرگ نے ۹۹۹ھ کے ماہ محرم الحرام میں وفات پائی (۲)۔ اور پرگنہ لار کے موضع تیلہ مولہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

بابا حیدر تیلہ مولیؒ کی دستیاب شدہ کتاب ''ہدایت المخلصین'' تصوف وعرفان کے علاوہ حضرت مخدوم کے کشف و کرامات اور ان کے مریدوں سے متعلق کشمیر میں اکبری دور میں فارسی نثر کی ایک عمدہ تصنیف ہے۔ حضرت مخدوم بابا حیدر کے مرشد کامل اور راہ سلوک میں ان کے پیشوا اور پیر طریقت تھے۔ اگرچہ یہ کتاب راہ سلوک پر گامزن ہونے والے سالک کی راہنمائی کے لئے تحریر کی گئی ہے لیکن کتاب کا بیشتر حصہ حضرت مخدوم کے مقامات اور کرامات پر وقف کیا گیا ہے۔ مصنف نے مذکورہ کتاب کو مندرجہ ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول: مبتدی کے اعمال کے بارے میں
باب دوم: مبتدی کے اشغال کے بارے میں
باب سیوم: مبتدی کے اذکار کے بارے میں
باب چہارم: نکاتِ تصوف کے بارے میں
باب پنجم: حضرت محبوب العالم اوران کے مخلصین ومریدین کے حالات کے بارے میں(۳)۔

پہلے باب میں بابا حیدر تیلہ مولیٰؒ نے راہ سلوک میں نوآموز سالک کے اعمال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب سالک اپنے مرشد کی خدمت میں آجائے تو مرشد کے لئے لازمی ہے کہ وہ سالک کو نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرنے کی تلقین کرے اور جب مبتدی کو اس کی عادت ہوجائے تو اسے ہمیشہ عبادت میں مشغول رہنے کی تعلیم دے بلکہ نماز فجر سے طلوع آفتاب تک مبتدی کو دنیاوی معاملات میں مشغول نہ رہنے کا درس دے اور یہ وقت وظائف واوراد میں گزارنے کا اسے درس دے۔مبتدی نماز اشراق سے چاشت تک ہر روز قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہے۔زوال کے وقت اپنے مرشد کی صحبت میں جائے۔نماز ظہر سے عصر تک کسب معاش میں مشغول رہے لیکن یہ کسب معاش مذہبی قوانین کے تحت حلال ہو۔نماز عصر سے مغرب کی نماز تک کسی کے ساتھ دنیاوی معاملات میں مشغول نہ ہو بلکہ اپنے مرشد کے دئے ہوئے وظائف میں مصروف رہے۔مغرب سے عشاء تک وظائف اور نوافل ادا کرتا رہے۔اور نماز عشاء کے بعد اپنے پیران کا شجرہ پڑھے(۴)۔

ہدایت المخلصین کا دوسرا باب نوآموز سالک کے اشغال سے متعلق ہے۔اس باب میں شیخ حیدر سالک کو اپنے مرشد کے بتائے ہوئے شغل پر گامزن ہونے کی نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سالک کو رات کا کچھ حصہ شرعی مسائل اور احادیث کے مطالعے میں گزارنا چاہئے کچھ حصہ آرام میں اور اگر ہوسکے تو بیدار رہ کر چشم دل تجلی ذات حق کے لئے کھلی رکھے(۵)۔

بابا حیدر کے بقول مبتدی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صائم الدھر، قائم اللیل، اور تارک اللحم ہو۔کیونکہ جب سالک ان چیزوں کا پابند ہو اور وظائف واوراد، افکار واذکار میں ہمیشہ محو ہو تو یقیناً وہ عالم ارواح اور عالم ملکوت کے راز منکشف کرسکتا ہے۔ سالک اپنے نفس امارہ کو پہچان کر ہی انسان یا آدمی ہے اور متذکرہ بالا اشغال کے انجام دینے سے انسان کی خودی محو ہوجاتی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی انسان مطلق نہیں کہلایا جاسکتا۔انسان کا وجود دراصل اس کی حقیقت ہے جو انسان کا وفات تک ساتھ نہیں چھوڑتا بلکہ جسم دراصل روح کے تابع ہے اور جس نے اتباع کیا اس نے حقیقت پائی(۶)۔

سالک کو بابا حیدر کے بقول غافل لوگوں اور عورتوں کی صحبت سے گریز کرنا چاہئے۔فتنہ انگیز اور آشوب آمیز لوگوں کے ملنے سے پرہیز اور اہل منصب سلاطین اور امراء جیسے دولت مند لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرنا چاہئے۔اس طرح سے شغل ید، شغل زبان، شغل دل، شغل نفس، شغل چشم اور شغل گوش وغیرہ جیسے اشغال بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں(۷)۔

ہدایت المخلصین کا تیسرا باب اذکار کے بارے میں ہے اس باب میں بابا حیدرؒ سالک کو ذکر کے طریقوں سے واقف کراتے ہیں۔ حضرت شیخ حمزہؒ نے جس ذکر کی اجازت خود بابا حیدرت کو دی تھی۔اس ذکر کی تلقین وہ اپنے مریدوں اور مخلصوں سے بھی کرتے ہیں وہ ذکر یہ ہے۔''**اللہ الحاضی اللہ المعشوق**''(۸) اس کے علاوہ اس باب میں بابا حیدرؒ سالک کو مراقبہ کے طریقے سے بھی آشنا کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سالک کو مراقبے سے قبل غسل یا طہارت کرنا چاہئے اور اپنے دل میں یہ نیت رکھنی چاہئے کہ فنائے وجود کی خاطر اپنے جسم کو صاف کرتا ہے۔ممکن ہے کہ محبوب مطلق اس کے دل میں جلوہ گر ہوسکے(۹)۔اس کے بعد بابا حیدرؒ سالک کو اس ذکر کی تلقین کرتے ہیں. **ھو المطلوب ھو المقصود**(۱۰)۔

جہاں تک ہدایت المخلصین کے چوتھے باب کا تعلق ہے۔ یہ پچھلے تین ابواب کے مقابلے میں مفصل تر ہے اور اس میں مصنف کے طریقت میں محبت، شوق، صلاح، تقویٰ اور تصوف کے بعض نصیحت آموز و رموز کو آشکارا کیا ہے اور ان اسرار و رموز میں کچھ تو ان کے پیر طریقت کے ارشادات پر مبنی ہیں۔

مصنف نے اس باب میں عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ تصور کرتے ہوئے لکھا ہے کہ درحقیقت محبت ایک ایسی خبر ہے جس سے کوئی شی خالی نہیں خواہ وہ مجازی رنگ میں ہو یا حقیقی صورت میں کیونکہ دنیا میں جو بھی شی قائم ہوگی وہ محبت کے بغیر نہیں ہوسکتی پس ہر ایک خبر جس میں محبت جیسی شئے ہوگی وہ شئے شئے مجازی ہوگی اور اس کی محبت مجاز پر قائم ہوگی (۱۱)۔ لیکن سالکوں کی محبت کا انحصار ان کی نیت پر ہوتا ہے۔ جیسے اس حدیث مبارک میں آیا ہے۔ ''**انما الاعمال بالنیات**'' لہٰذا عشق مجازی میں محض نیت پر انحصار ہوتا ہے۔ چنانچہ ''**المجاز قنطرہ الحقیقت**'' عشق بازی میں بے حد ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اسے مجاز سے حقیقت کی طرف رہنمائی کر سکے ورنہ ضلالت کی دلدل میں فنا ہو جانے کا خطرہ ہے (۱۲)۔

سالک کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں معرفت کی حیثیت موجود ہو۔ معرفت دو طرح کا ہے معرفت نفس خود اور معرفت حق تعالیٰ لیکن ان دونوں میں معرفت نفس مقدم ہے کیونکہ جس شخص نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اس نے خدا کو بھی نہیں پہچانا چنانچہ **من عرف نفسہ فقد عرف ربہ** (۱۳)۔

ہدایت المخلصین کا پانچواں باب جو آخری باب ہیں۔ اس باب میں بابا حیدرؒ نے اپنے مرشد کامل حضرت مخدومؒ کے حالات اور ان کے کشف و کرامات درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بابا حیدر نے اس باب میں اپنے پیر طریقت کے اہم خلفاء کے حالات اور راہ سلوک میں ان کے مشاغل اور بعض کی تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس باب میں چونکہ مصنف نے کشمیر میں اپنے معاصر صوفیوں، عارفوں اور مجذوبوں کے احوال نہایت شرح وبسط کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ اس لحاظ سے مذکورہ کتاب کا یہ باب اکبر کے عہد میں کشمیر کے بعض فارسی عالموں، فاضلوں اور ادیبوں کے احوال اور ان کی تصنیفات سے متعلق پہلے درجے کا مآخذ قرار پاتا ہے۔ اس تصنیف میں جن معاصر علماء، صوفیا، اور مشائخ کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں زین علی (۱۴) بابا داؤد خاکی (۱۵)، مولی شیخ احمد چاگلی (۱۶)، خواجہ حسن قاری (۱۷)، خواجہ اسحٰق قاری (۱۸)، مولانا جوہر نانت (۱۹)، بابا علی رینہ (۲۰)، زین علی مانچو (۲۱)، و، خواجہ میرم بزاز (۲۲) قابل ذکر ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف خاص راہ طریقت شخص کے لئے مفید ہوگا بلکہ ہر عام انسان کے لئے نہایت فائدہ بخش ہوگا۔

حوالہ جات۔

۱۔ ہدایت المخلصین از بابا حیدرؒ برگ ۱۶۶م الف مخطوط کتب خانہ جموں و کشمیر محکمہ تحقیق و اشاعت سری نگر زیر شمارہ ۴۹۷

۲۔ ایضاً برگ ۲۳۳م الف ۳۔ ایضاً برگ ۲م الف ۴۔ ایضاً برگ ۳م الف

۵۔ ایضاً برگ ۵م الف ۶۔ ایضاً برگ ۵م الف ۷۔ ایضاً برگ ۶م الف

۸۔ ایضاً برگ ۷م الف ۹۔ ایضاً برگ ۱۰م الف ۱۰۔ ایضاً برگ ۱۲م الف

۱۱۔ ایضاً برگ ۱۳م الف ۱۲۔ ایضاً برگ ۱۴م الف ۱۳۔ ایضاً برگ ۳۲م الف

۱۴۔ ایضاً برگ ۱۹۱م الف ۱۵۔ ایضاً برگ ۸۴۔۱۹۹م الف ۱۶۔ ایضاً برگ ۱۰۶م الف

۱۷۔ ایضاً برگ ۱۱۲م الف ۱۸۔ ایضاً برگ ۱۵۴م الف ۱۹۔ ایضاً برگ ۱۴۵م الف

۲۰۔ ایضاً برگ ۱۲۶م الف ۲۱۔ ایضاً برگ ۱۱۸۔۱۹۹م الف ۲۲۔ ایضاً برگ ۱۷م الف

عمر خلیق
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

زرتشتیوں کی ہندوستان آمد

چکیدہ: سرزمین ہندوستان نہ صرف ہندومت، جین مت، بدھ مت اور سکھ مت جیسے عظیم مذاہب کی جائے پیدائش رہی ہے، بلکہ بیرون ملک سے آنے والے دوسرے مذاہب کی پذیرائشگاہ بھی رہی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ سرزمین ہند کی کشادہ دلی نے جنگ قادسیہ ونھاوند کے فاتحین اور مفتوحین دونوں کو ہی اپنے دامن میں پھلنے پھولنے کا موقعہ دیا۔ اسلام اور دین زرتشت دونوں آٹھویں صدی عیسوی میں ھندوستان میں داخل ہوئے اور دونوں نے بقدر استعداد فیض حاصل کیا۔ غیر تبلیغی دین ہونے کی وجہ سے دین زرتشت اسلام کی گشترش کا مقابلہ نہ کرسکا لیکن صدیوں بعد بھی انکی مختصر جماعت اپنے دین، عقائد اور رسم رواج کی بخوبی پاسداری سے عھد ساسانی کی یادیں تازہ کیے ہوئے ہے۔

کلیدی الفاظ: ہندومت، جین مت، بدھ مت، سکھ مت، قادسیہ، نھاوند۔

سن ۲۱ ہجری میں اسلامی فوج کے سپہ سالار "احنف بن قیس" نے نہ صرف ایران پر فتح حاصل کی بلکہ آخری ساسانی حکمران یزدگرد سوم کو بھی ایران کے حدود سے باہر نکال دیا۔ یزدگرد کے روپوش ہونے کے بعد ایرانی مجوسی تین مختلف گروہ میں تقسیم ہوئے۔ پہلا گروہ اسلام کی عظیم نعمت سے سرفراز ہوا, دوسرے گروہ نے جزیہ کے عوض صلح کی اور مختلف مسائل سے دوچار ہوئے پر اپنے اصل دین وزمین پر قائم رہے جبکہ تیسرا گروہ جو خراسان کے خالص پارسیوں پر مشتمل تھا اسنے نہ صرف اسلام کا انکار کیا بلکہ جزیہ کی ادائیگی بھی ان پر گراں گزری چنانچہ راہ فرار اختیار کر یہ گروہ "یزدگرد" کی طرح روپوشی کی زندگی بسر کرنے لگا۔

اسلامی فوج نے ایران پر فتح تو حاصل کر لی لیکن جہاں ایران کی وسعت وکشادگی شریعت اسلام کے مکمل نفاذ میں رکاوٹ کا سبب بنی وہیں ایران کے دوسرے علاقائی امراء کے رسوخ کے خاتمے اور مختلف بغاوتوں کی سرکوبی میں اسلامی شمشیریں اور تدبیریں ماند پڑ گئیں اور اسلام کی تندرفتار تبلیغ کے پاؤں بوجھل ہوگئے۔ آخری ساسانی تاجدار "یزدگرد" کی روپوشی اسلامی سپہ سالار اور خلفاء کے اضطراب میں بتدریج اضافہ کرنے لگی۔ خلیفہ حضرت عثمان کے عھد میں بصرہ کے گورنر اور اسلامی دنیا کے معروف سپہ سالار "عبداللہ بن عامر" کو جب خراسان کی مہم پر روانہ کیا گیا اسی وقت یہ افواہ تیزی سے پھیلی کہ "یزدگرد" نے کرمان میں پناہ لی ہے چنانچہ "عبداللہ بن عامر" نے اسلامی فوج کے ایک دستہ پر "مشاجع بن موسی سلمی" کو سپہ سالار مقرر کر کرمان کی مہم پر روانا کیا اور خود خراسان کی مھم پر نکل پڑے۔ کرمان پہنچ کر "یزدگرد" کے بجائے اسلامی دستہ کی مڈبھیڑ فرار شدہ مجوسیوں کے اس گروہ سے ہوئی جس نے اسلام اور جزیہ دونوں کا انکار کر راہ فرار اختیار کی تھی اور اب حالت روپوشی میں کرمان اور اسکے قرب وجوار میں اپنے گروہ کو تقویت بخش رہے تھے۔ اسلام اور جزیہ کی پیشکش کے بعد جب مجوسیوں کا یہ گروہ کسی بات پر راضی نہ ہوا تو بلا فاصلہ "مشاجع بن موسی سلمی" اور مجوسیوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی، اسلامی دستہ مجوسیوں کی تعداد اور مہین پرستی کی تاب نہ لا سکا اور میدان جنگ سے جان ومال کے عظیم خسارے کے ساتھ اپنے پاؤں پیچھے کی طرف کھینچ لیے۔ خراسان میں "عبداللہ بن عامر" کو جب اسلامی دستہ کی اس ناقابل قبول شکشت کی خبر ہوئی تو فورا اپنی فوج کے ہمراہ "مشاجع بن موسی سلمی" کی مدد کو پہنچے

اور پھر اس زور کا حملہ کیا کہ مجوسیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اکثر مجوسی قتل کئے گئے بعض نے جان و مذہب دونوں کی بقاء کے لئے جزیہ کی ادئیگی پر رضامندی ظاہر کی جبکہ بعض مجوسیوں نے راہ فرار اختیار کر لی۔ فرار شدہ مجوسیوں کا یہی گروہ سو سال پہاڑوں اور غاروں میں دربدر کی ٹھوکر کھاتا ہوا "ھرمز" پہنچا۔

بکوہستانہ ہمہ ماندند صد سال
چوایشان رابدین گونہ شدہ حال

گر چہ کرمان پر دوبارہ حملہ میں بظاہر "عبداللہ بن عامر" کی فتح ہوئی لیکن مورخین لکھتے ہیں کہ "فتح الفتوح کے بعد ایران کے علاقائی امراء کی سرکوبی میں اسلامی دستہ کا جتنا نقصان کرمان کی فتح میں ہوا اتنا نقصان کبھی اور نہ ہوا"۔ احمد بن یحیی البلاذری متوفی بہ۲۷۹ھ نے بھی اپنی کتاب "فتوح البلدان" میں سقوط کرمان کے ذکر میں اس سانحہ کو بیان کیا ہے جس میں یہ واضح ہے کہ شکست کے بعد چند لوگوں پر مشتمل مجوسیوں کا ایک گروہ "ھرمز" کیطرف روانہ ہوا تھا۔

"ھرمز" ایران کے ساحلی شہر "بندرعباس" سے تقریباً۸ کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک بیضوی جزیرہ ہے جو۴۲ مربع کیلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اھل زرتشت نے جب ایران کو خیرآباد کہا تو اولاً اسی جزیرہ پر مقیم ہوئے اور "ھرمز" نامی ایک شھر بسایا۔ گمان غالب ہے کہ "ھرمز" نام بھی ان مہاجر مجوسیوں نے رکھا ہوگا کیونکہ لفظ ھرمز "اھرمزد" کا مخفف یا اسکی ترمیم شدہ شکل ہے پس ایک ایسی سرزمین جو جان و مال کی بقاء کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھانے والوں کو پناہ دے اسکو اپنے خدا کے نام سے موسوم کردینا ایک فطری عمل ہے۔ زرتشتیوں کی پناہ گاہ یا گذرگاہ ہونے کی وجہ سے قدیم زمانے میں جزیرہ ھرمز کو "مغستان" کہا جاتا تھا لیکن زرتشتیوں نے جب وہاں "ھرمز" نامی شہر بسایا تو رفتہ رفتہ یہ جزیرہ بھی "ھرمز" کے نام سے مشہور ہوگیا۔

شہر "ھرمز" کی فضاء اہل زرتشت کو ہرگز راس نہ آئی۔ پندرہ سالہ قیام میں وہاں نہ صرف مختلف پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا بلکہ عرب فاتحین کے ہاتھوں نیست و نابود ہونے کا خوف بھی ستانے لگا بالآخر ایک ستارہ شناس نے علم نجوم کی بنیاد پر مستقبل میں رونما ہونے والی ایک ناقابل تحمل آفت سے نفقط اپنی قوم کو آگاہ کیا بلکہ وہاں سے کوچ کر جانے کا بھی حکم دیا۔

ہمودرزیچہ ای کہنہ دیدہ — کہ بر ما آب خور آخر رسیدہ
اگراین بوم بگذاریم شاید — کنون زین ملک بیرون رفتہ باید
وگرنا ماہمہ اقلیم دردام — خرد باطل شود کاری شود خام

ستارہ شناس کے اس مشورہ پر "ھرمز" کے تمام زرتشتی بذریعہ کشتی ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے۔ زن، مرد اور بچوں پر مشتمل یہ گروہ چند روزہ سمندری سفر کے بعد گجرات کے قریب ایک جزیرہ پر پہنچا جہاں انیس سالہ قیام کے بعد جب اشیائے خورد و نوش اور دیگر لوازمات زندگی کی قلت سے لوگوں کی زندگیاں عاجز آ گئیں تو دوبارہ اس ستارہ شناس نے وہاں سے "گجرات" ہجرت کرنے کا حکم دیا۔

بزیچ اندربدیدہ پیردستور
ہمانکہ گفت ای یاران پرنور
ازین جارفت بایدجای دیگر
کہ در آنجا بود ماوای دیگر

اس پیر دانا کے حکم پر اہل پارسی ایک کشتی پر سوار ہوکر "گجرات" کی طرف نکل پڑے۔ ابھی چند ہی پہر گذرے تھے کہ کشتی

ایک شدید سمندری طوفان سے دو چار ہوئی۔ لوگوں کو ہلاکت کا خوف ستانے لگا۔ جب بادبانوں کی تمام تدابیر شدت طوفان کے سامنے بے بس ہوگئیں تو لوگوں نے صلاحیت عیبی ناخدا سے کرامت غیبی خدا کی طرف گریز کیا اور خدائے واحد "اھورمزد" کے دربار میں نہ صرف اپنے تحفظ کے لیئے دعا کی بلکہ طوفان سے نجات کے صلہ میں گجرات پہنچنے کے بعد "آتش بھرام" روشن کرنے کا بھی وعدہ کیا پس اچانک خدائے واحد کی غیبی مدد نازل ہوئی یکا یک طوفان کی تاریکی چھٹ گئی۔ تیز لہریں مسطح زمین کی مانند ہوگئیں اور سمندری خنکی نے طوفان سے ہواس باختہ لوگوں میں ایک تازہ روح پھونک دی اور لوگ ایک نئی زندگی کی امید لئے گجرات کی طرف کشتی کو بڑھانے لگے۔

زرتشتیوں کی گجرات آمد غالباً ۷۷٦ عیسوی میں ہوئی۔ اسوقت جدی رانا گجرات کا حاکم تھا، تقریبا دوسو بے یارومددگار افراد پر مشتمل پارسیوں کا یہ قافلہ جب برسوں کی در بدر کی ٹھوکروں کے بعد گجرات پہنچا تو بغرض امداد انکے ایک نمائندہ نے مع تحائف بادشاہ گجرات "جدی رانا" کی خدمت میں حاضر ہوکر مدد کی گہار لگائی۔ اولاً شاہ گجرات اور درباریوں نے اس امدادی گہار کو کسی سیاسی سازش کا حصہ سمجھا لیکن جب جدی رانا نے ہجرت کی تفصیل سنی تو ان پر کرم فرما ہوا اور مندرجہ ذیل شرائط پر قیام کے بندوبست کا وعدہ کیا۔

۱......مہاجرین اپنی زبان "پہلوی" ترک کر گجرات میں رائج زبان کا استعمال کریں۔

۲......مہاجر عورتیں اپنے روایتی لباس ترک کر ہندوستانی لباس "ساڑی" زیب تن کریں۔

۳......مہاجرین اپنے تمام اسلحے بادشاہ کے قدموں میں ڈال دیں اور اپنی کمر سے تلوار باندھنے کی عادت ترک کردیں۔

نمائندہ نے چار و ناچار تمام شرائط قبول کر اپنے عقائد و مذہب کی تفصیل بادشاہ کے حضور پیش کی جس سے جادی رانا حد درجہ متاثر و مھربان ہوا اور مھاجروں کی پسند سے ایک سرسبز و شاداب زمین انکے قیام کیلئے مختص کردی جسکا نام سنجان رکھا گیا۔

چو هندو راجه این گفتار دستور — شنید و سر بسر دل گشت معمور
زمین آن یکا یک در نظر کرد — فراخی دید و موبد را خبر کرد
چو دستوران زمین نیک را دید — در آنجا بهر ماندن جای بگزید
مر اورا نام کرد سنجان دستور — بسان ملک ایران گشت معمور

حسب وعدہ سرزمین سنجان پر ایک عظیم آتشکدہ کی تعمیر ہوئی جہاں آتش بھرام روشن کی گئی۔ آئندہ تین صدیوں تک مہاجریں اور انکی نسلیں سنجان میں مقیم رہیں۔ بعدازآن یہ لوگ ہندوستان کے مختلف علاقوں بالخصوص بمبئی اور نوساری میں جا بسے۔ آج بھی بیشتر زرتشتی بمبئی و گجرات میں مقیم ہیں۔

منابع و ماخذ:

۱ قصہ سنجان، بھمن بن قیقباد، لطف الدولہ اورئینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، حیدرآباد، آندھراپردیس، 1964۔

۲ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ(جلداول(، ڈاکٹر ثروتصولت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشر، دہلی، 2006۔

۳ History,ParsiinStudy پروفیسر ایس ایچ ہوڈی والا، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی، 1920۔

۴ جدی رانا اور قصہ سنجان، پروفیسر ایس ایچ ہوڈی والا، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی، 1913۔

۵ افسانہ مہاجرت زردشتیان بہ ھند، سید مہدی موسوی، کتاب ماہ تاریخ وجغرافیا، مھر 1389 – شمارہ 149۔

ارشد جمیل
ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی وفارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

سفرنامہ کی تاریخی اور سماجی اہمیت

کلیدی الفاظ:۔سفرناموں کی تاریخی وسماجی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیوں کہ سفرناموں سے ایسے بہت سے واقعات اور حادثات کا پتہ چلتا ہے جو ہمیں عام تاریخی کتابوں میں نہیں ملتے۔تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی سفرنامے ہمارے لیے تاریخ کا ایسا مواد فراہم کرتے ہیں جو بذات خود ایک تاریخ بن جاتے ہیں کسی خاص زمانے میں لوگوں کا سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کیا تھا یہ ساری باتیں تاریخ میں نہیں ملتی ان میں تو صرف بادشاہوں کی تبدیلی اور بڑے بڑے واقعات کا حال ملتا ہے۔تاریخ اگر بے جان واقعات کو بیان کرتی ہے تو سفرنامے زندہ واقعات کی تاریخ ہیں بلکہ سفرنامے کو اپنے عہد کی تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

''سفر''عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، کوچ کرنا، سیاحت کے لیے نکلنا کے ہیں۔اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے اور انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اردو کی طرح فارسی میں بھی یہ لفظ عربی سے مستعار ہے جس کے معنی مسافرت، سیاحت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کے ہیں۔''نامہ'' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی لکھے ہوئے خط فرمان یا عمومی طور پر تحریر شدہ عبارت کے ہیں اسلئے اردو کے علماء نے ''سفر'' عربی سے اور ''نامہ'' فارسی سے لے کر سفرنامہ کی اصطلاح وضع کی۔اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامے کے معنی ومفہوم پر بھی اظہار خیال کیا جائے۔اس سلسلے میں پہلے اردو، عربی اور انگریزی زبانوں کی مستند لغات کے ذریعہ سفرنامہ کے معنیٰ ومفہوم جاننے کی کوشش کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ادباء اور ناقدین کی آرا کا ذکر کرتے ہوتے ہوئے ''سفرنامہ'' کی ایک جامع اور موزوں تعریف پیش کرنے کی میری کوشش ہوگی۔

سفر نامہ کو ہندی میں ''یاترا ویرتانت'' اور انگریزی میں "Travelogue" کہا جاتا ہے جب کہ عربی میں "Travelogue" کو "محاضره مصورة عن الرحلة" کہا جاتا ہے جس کا مطلب مصور سفرنامہ ہے یعنی ایسے سفرنامے پر مشتمل ڈائری جس میں حالات و واقعات کے ساتھ تصویریں بھی ہوں۔

نوراللغات میں مولوی نورالحسن نیّر نے لفظ ''سفرنامہ'' کے معنیٰ ''سفر کے حالات اور سرگزشت'' لکھے ہیں۔[۱]

فرہنگ آصفیہ میں سفرنامہ کے متعلق لکھا ہے:

''سفرنامہ (ع+ف) اسم مذکر، سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روزنامچۂ سفر، حالات وسرگزشت سفر''۔[۲]

فیروز اللغات میں سفرنامہ کے سلسلے میں تحریر ہے:۔

''سفر نامہ (مذکر)، سفر کے حالات پر کتاب، سیاحت نامہ''، درج ہے۔۳

عربی کی مشہور لغت 'المنجد' میں ''الرحلۃ'' کے ایک جو معنی ملتے ہیں وہ یہ ہیں۔

''قصة المسافر عما جری له فی سفره'' (مسافر کو دوران سفر پیش آنے والے واقعات و حوادث کا بیان)۔۴

انگریزی لغات میں سفر نامہ کے لئے ''Travel'' اور ''Travelogue'' کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی تدوین کردہ انگریزی اردو لغت ''The Standord English Urdu Dictionary'' میں سفر کے جو معنیٰ تحریر کئے ہیں وہ ہے:

''باتصویر لکچر، سیاحت کی مہم وغیرہ پر تقریر سے متعلق سیاحت، داستان سفر''۔۵

سفر نامہ کے معنیٰ و مفہوم کے سلسلے میں مذکورہ لغات کے مطالعہ سے اس کی جو لغوی تعریف سامنے آتی ہے اسے مختصر طور پر کچھ اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ سفر نامہ کسی مسافر یا سیاح کے سفر کے مشاہدات و واقعات اور تجربات کے اس بیان کو کہتے ہیں جو بالخصوص کتابی شکل میں ہو، اردو میں سفر نامہ روداد سفر یا سفری تجربات، مشاہدات کو رقم کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سفر نامہ کے لغوی معنیٰ و مفہوم پر بحث کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر بھی غور کیا جائے کہ ادبی اصطلاح میں ''سفر نامے'' سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے اردو ادب کے حوالے سے جن محققوں نے سفر نامے پر تحقیقی کام کیا ہے اور انھوں نے سفر نامے کی جو تعریف متعین کی ہے اس کو پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قدسیہ قریشی نے اپنی کتاب ''اردو سفر نامے انیسویں صدی میں'' سفر نامہ کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''سفر نامہ وہ طرز تحریر اور اسلوب بیان ہے جس میں انسان یا سیاح اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی، دلی اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے''۔۶

ڈاکٹر انور سدید نے سفر نامے سے متعلق اپنی کتاب ''اردو ادب میں سفر نامہ'' سفر نامہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے''۔۷

ڈاکٹر خالد محمود نے اپنی تصنیف ''اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ'' نامی کتاب میں سفر نامے کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے''۔۸

ڈاکٹر محمد شہاب الدین نے اپنی کتاب ''اردو میں حج کے سفر نامے'' کی تعریف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو

تحریر رقم کرتا ہے وہ سفرنامہ ہے۔''۹؎

ترقی پسند ناقد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے اپنے سفرنامہ ''لندن اولندن'' میں سفرنامے کے سلسلے میں تحریر کیا ہے:۔

''سفرنامہ کیا ہے؟ کچھ تو تجربات جو مسافر اپنے دوران سفر کئے، کچھ عجائب وغرائب جو سیر وسفر کرنے والے نے دیکھے، اور کچھ مقامات کی دل فریبی، مختلف ممالک میں زندگی بسر کرنے والوں کی سماجی حالات اور ان رسم ورواج، ان کی پسند وناپسند سب کا بیان۔ اب یہ بیان سفر کرنے والے کی اپنی بصیرت اور بصارت دونوں پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر انھیں بیان کرنے کی اس میں کتنی قدرت ہے، وہ صرف مقامات کا احاطہ کرتا ہے یا ان مقامات کے گردوپیش، ان کی تاریخ، ان کے ادب اور ان کی زندگی کے کیف وکم کو اپنے سفر کی مدد سے بیان کرتا ہے''۔۱۰؎

انسانی زندگی میں سفر کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے۔ سفر متعدد مقاصد کیلئے اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تجارتی اور معاشی ضرورت کیلئے سفر اختیار کیا جاتا ہے تو کبھی اسے حصول علم اور ترویج علم کے لئے وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ یہ نئے علاقوں اور خطوں کی دریافت کا بھی ذریعہ ہے۔ عہد حاضر کے اہم نقاد پروفیسر علی احمد فاطمی اپنی کتاب ''احتشام حسین ذکر وفکر'' میں سفر کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

''ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا محض سفر کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ مشاہدہ وتجربہ کی ایک دنیا سامنے آتی ہے اور اگر مسافر کے پاس چشم بینا ہے تو وہ قطرہ میں دجلہ دیکھ لیتا ہے۔''۱۱؎

سفر انسان کو مذہبی عبادات اور عقیدت کے اظہار کا موقع فراہم کرتا ہے اور اسکی روحانیت کو جلا بخشتا ہے۔ یہ دعوت دین اور تبلیغ مذہب کا وسیلہ بھی ہے اس سے انسان دوستی اور اخوت کے پیغام کو مستحکم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ آج کے دور میں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ مقامی، ملکی اور عالمی صورت حال سے آگاہ کرنے اور باہمی روابط قائم کرنے کے لئے سفر کو بھی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ سفر کی اس اہمیت کے پیش نظر بہت سے لوگوں نے اپنے سفر کی روداد کو محفوظ کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے چنانچہ جب انسان سفر کرتا ہے تو اسے دوسرے ملکوں کے رسم ورواج، طرز معاشرت، تعلیم وتربیت، تہذیب وتمدن، سیاسی اور انتظامی امور سے واقفیت ہوتی ہے۔ سفر کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ نامور ادیب اور سیاسی رہنما امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''میں نے آدھا علم سفر سے حاصل کیا ہے۔ مطالعہ کی تنہائیوں نے مجھے ذہنی بالیدگی بخشی لیکن سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی۔ جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔ سفر انسان کو قوموں کی سرگزشت اور ملکوں کی تاریخ کا بالواسطہ علم بخشتا ہے جس طرح سائنس کے معلموں میں حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح سفر سے صفات انسانی کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے اور مختلف اقوام کے مزاج وطبائع کا پتہ چلتا ہے۔''۱۲؎

اس طرح ان تمام آراء کا مطالعہ وتجزیہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سفرنامہ ایک بیانیہ صنف ہے، سفرنامہ نگار دوران سفر جن چیزوں کو دیکھتا ہے اور مشاہدات کے زیر اثر اس کے اندر جو احساسات وتاثرات پیدا ہوتے ہیں، انھیں وہ صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا ہے اسی سے سفرنامہ وجود میں آتا ہے۔ اگر سفرنامہ کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ سفرنامہ وہ

بیانیہ صنف ادب ہے جس میں سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے مشاہدات، واقعات، تجربات اور قلبی تأثرات کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے۔ ادبی سفر نامہ اپنی ماہیئت کے اعتبار سے علم نہیں فن ہے اور فن کا مقصد حصول مسرت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تحریر ادب نہیں ہوسکتی ادب وہی ہوگا جس میں زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی سچی ترجمانی حسین انداز میں کی گئی ہو، سفر نامے کو اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سفر نامہ نگار اپنی تحریر کے ذریعہ نہ صرف معلومات بہم پہونچاتا ہے بلکہ وہ اپنے تخلیقی تجربہ میں اپنے احساسات اور جذبات کے ذریعہ دوسروں کو بھی شریک کر لیتا ہے، یوں سفر نامہ معلوماتی تحریر سے ادبی صنف کے دائرے میں آجاتا ہے گویا سفر نامہ کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ سفر نامہ نثری ادب کی صنف ہے جس میں سفر کے متعلق کسی ادیب یا فنکار کے تجربات اور مشاہدات کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے جس کی نوعیت عام بیان کے بجائے ادبی ہوتی ہے۔

سفر ناموں میں حقیقت کا تصور تاریخی حقیقتوں سے مختلف ہوتا ہے، ایک مورخ صرف سنہ واقعہ اور کسی سلطنت یا عہد کے عروج وزوال پر زور دیتا ہے جبکہ سیاح ایک چیز کو اپنے پورے سیاق وسباق کے ساتھ پیش کر دیتا ہے ممکن ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس میں بعض چیزیں غلط ہوں وہ اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ سیاح تاریخی حقیقتوں کے پیش نظر کسی ملک کا سفر نہیں کرتا بلکہ اس کے سفر کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں اس لیے وہ جن چیزوں کو دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے ان کے بارے میں ایک رائے قائم کرنے کے بعد حالات اور واقعات کو قلم بند کر دیتا ہے وہ ان کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کے بارے میں سطحی طور پر تو ضرور نگاہ ڈالتا ہے لیکن ان کی چھان بین نہیں کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بنیاد حقیقت اور تاریخ پر ہی ہوتی ہے جس میں سیاح کے اپنے تاثرات اور احساسات بھی شامل ہوتے ہیں۔ دراصل انھیں احساسات اور تاثرات سے سیاح حالات وواقعات کی دلکش وخوبصورت تصویر بنا کر پیش کرتا ہے، یہ تصویریں ہی سفر نامے میں کسی جگہ یا ملک کی تاریخ ہیں، سفر ناموں کی تاریخی اہمیت یہی ہے کہ وہ ان حالات اور واقعات کا ایسا بیان کرتے ہیں جو عام طور پر تاریخی کتابوں میں کم ملتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ تاریخیں تو مصلحت وقت کا شکار بھی ہوسکتی ہیں اور حاکم وقت کے عتاب اور ظلم کے خوف سے بہت سی باتیں چھپائی یا نظر انداز کی جاسکتی ہیں، لیکن سفر نامے میں اس بات کا اندیشہ نہیں ہے اس لئے کہ سفر نامہ چاہے دوسرے ملک کے بارے میں ہو یا اندرون ملک کے متعلق ہو عموماً کسی بات کے چھپائے جانے کا امکان کم ہی رہتا ہے۔ اس طرح تاریخی حقائق اور سفر ناموں کے حقائق میں فرق ہونے کے باوجود سفر نامے کسی جگہ یا ملک کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو تاریخی کتابوں میں بھی نہیں ملتی، اس لئے اس طرح کے سفر ناموں کو دیکھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفر ناموں سے کسی بھی ملک کے تاریخی، سماجی، تجارتی اور معاشرتی حالات کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کیوں کہ سیاح جس ملک کا سفر کرتا ہے وہاں کے مذہبی، ادبی، معاشی، تعلیمی، صنعتی اور تجارتی حالات کے ساتھ ساتھ تاریخی اور سماجی حالات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ چوں کہ سفر نامہ ایک مسافر کا مخصوص روز نامچہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنے سفر کے حالات درج کرتا ہے۔ سفر نامہ نگار سیاحت کے حالات وواقعات مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سفر ناموں میں لوگوں کے اقتصادی حالات کو بھی بیان کرتا ہے اور وہاں کے لوگوں کا پیشہ کیا ہے، وہاں کیا کیا چیزیں تیار کی جاتی ہیں یعنی صنعتی لحاظ سے اس ملک یا شہر کی کیا حیثیت ہے اس پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

تاریخ اور سفر نامہ میں یہ فرق ہے کہ تاریخ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ مواد سے ترتیب دی جاتی ہے جبکہ سفر نامہ سیاحت کے حالات وواقعات، مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتا ہے۔ سفر نامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالباً کسی ملک کے جملہ حالات جاننے کے لیے تاریخ سے زیادہ سفر نامے مفید ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ تاریخ سے تو واقعات اور

طرز حکومت کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن سفر نامے تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں ۔سفر نامہ میں سیاح تاریخ کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کے پس منظر کو بھی سامنے لاتا ہے اور جغرافیائی حالات کو بھی بیان کرتا ہے مثلاً وہاں کی آب وہوا ،پیداوار،قدرتی مناظر،دریا، پہاڑ اور جنگل وغیرہ کا بھی تذکرہ کرتا ہے اس لئے سفر ناموں کو علم جغرافیہ کی بنیادی اینٹ کہا جا سکتا ہے ۔سفر ناموں کی تاریخی اور سماجی اہمیت پر غور کرتے وقت جو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ سفر ناموں نے ہی تاریخ کو جنم دیا ہوگا ،غرض یہ کہ سفر نامے اپنے عہد کی تاریخ کا آئینہ دار ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ یہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں جس سے تاریخ کی کھوئی ہوئی کڑیاں مل جاتی ہیں اس لئے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ سفر ناموں کے ذریعہ ہی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہونچی ہوں گی ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سفر نامے ہماری قدیم یا وسطی تاریخ وتہذیب کی آگہی کا بہت اہم سرچشمہ ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ سفر ناموں میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ من وعن تسلیم کر لیا جائے اور ہر بات کو صحیح تاریخ کا ایک جز مان لیا جائے ۔لیکن اتنا ضرور ہے کہ سفر نامے میں ہمیں ایسا تاریخی اور سماجی مواد ملتا ہے جو عام تاریخی کتابوں میں بھی نہیں ملتا یہ مواد کسی ملک کی تاریخ اور وہاں کی سماجی اور تہذیبی قدروں کو سمجھنے میں ایک خالص تاریخی کتاب سے زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سفر نامے تاریخی اور سماجی اعتبار سے ہمیشہ اہم رہے ہیں بلکہ تاریخ کی تمام تر ترقی کے باوجود سفر نامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت سدا مسلم رہے گی ۔

حواشی:

۱۔(مولوی نور الحسن نیّر :نور اللغات ،لکھنو ،نیّر پریس ،۱۳۴۷ھ،ص/۱۲۳)

۲۔(مولوی سید احمد دہلوی: فرہنگ آصفیہ لاہور ،اردو سائنس بورڈ ،۱۹۸۷، ج۲،ص ۴۳۱)

۳۔(مولوی فیروز الدین :فیروز اللغات جدید ایڈیشن ،اسلامک پبلیشر ،ص ۴۲۶)

۴۔(لویس معلوف :المنجد بیروت ،المطبعۃ الکانولیکۃ ،ت ۔ن ۔مادہ :رحل)

۵۔(ڈاکٹر عبدالحق :''The Standord English Urdu Dictionary'' نئی دہلی ،انجمن ترقی اردو ،۲۰۰۱ء،ص ۲۰۱)

۶۔(ڈاکٹر قدسیہ قریشی ۔اردو سفر نامے انیسویں صدی میں ،نئی دہلی ،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ،۱۹۸۷،ص/۵۲)

۷۔(ڈاکٹر انور سدید ۔اردو ادب میں سفر نامہ ۔لاہور ،مغربی پاکستان ،اردو اکیڈمی ۔ص ۵۲)

۸۔(ڈاکٹر خالد محمود ۔اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ ۔نئی دہلی ،۱۹۹۵ء،ص/۲۲)

۹۔(ڈاکٹر محمد شہاب الدین ۔اردو میں حج کے سفر نامے ۔یونی ورسل بک مارس ،علی گڈھ ،ص/۲۶)

۱۰۔(سید محمد عقیل رضوی ۔لندن اولندن ،ص/۷)

۱۱۔(احتشام حسین ذکر وفکر ،علی احمد فاطمی ،ص/۹۲)

۱۲۔(آجکل :اردو سفر نامہ ،مرتبہ محبوب الرحمان ،ابرار رحمانی ،پیش لفظ ۔ص/۲)

تحسین بانو
ریسرچ اسکالر، شعبہ عربی وفارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ایرج کی شاعری میں ماں کی عظمت

ایرج میرزا ملقب بہ جلال الممالک ۱۲۹۰ھجری قمری میں تبریز میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام غلام حسین میرزا تھا جو مظفر الدین شاہ کے درباری شاعر تھے جن کا لقب ''صدر الشعراء'' تھا اور ''بھجت'' تخلص کرتے تھے۔ایرج کے دادا کا نام ملک ایرج بن فتح علی شاہ قاجار تھا۔اس نسبت سے فتح علی شاہ آپ کے پردادا تھے۔آپ کا نام ایرج آپ کے دادا کے نام پر تھا اس لئے لوگ ایرج کو احتراماً امیر خان کہتے تھے۔قاجاری خاندان نے ایران میں ۱۷۹۴ء سے ۱۹۲۵ء تک حکومت کی۔

ایرج بچپن سے ہی ذہین، زود گو اور حاضر جواب تھے اور شعر وشاعری کا شوق رکھتے تھے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم جن اساتذہ سے حاصل کی ان میں آقا محمد تقی عرف عارف اصفہانی اور مرزا نصر اللہ عرف بہار شیروانی کے نام خاص طور پر لئے جاسکتے ہیں اس کے بعد فرانسیسی زبان سیکھنے کی غرض سے دار الفنون تبریز میں داخل ہوئے۔فرانسیسی زبان میں کمال پیدا کرنے کے بعد منطق و معنی میں بھی مہارت حاصل کی۔حسن علی خان عرف امیر نظام گروسی کو ایرج سے بہت انسیت تھی۔ایرج کا موجودہ دیوان جسے محمد جعفر محجوب نے ترتیب دیا ہے، وہ قصائد، غزلیات، قطعات، رباعیات ومثنویات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ایرج کے دیوان میں ملک کے سیاسی واجتماعی حالات، تعلیم کو دکان، تعلیم نسواں، عورتوں کی آزادی، غریب طبقہ، مزدوروں اور علماء دین کے ساتھ ماں کی عظمت کو بیان کرنے والے بھی اشعار ملتے ہیں۔

ایرج نے اپنے اشعار کے ذریعے ہمیں ماں کی عظمت کے بارے میں بتایا کہ ماں خدا کا دیا ہوا نایاب تحفہ ہے جس کے پاس ماں ہے اسکے پاس دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔والدین اپنی اولاد کی پرورش ونشو نما میں بہت تکلیف اٹھاتے ہیں خاص طور پر ماں زیادہ پریشان ہوتی ہے۔اس دنیا میں ماں ہی وہ واحد ذات ہے جو سب سے زیادہ ہم سے شفقت ومحبت کرتی ہے۔ہمارے غموں میں ہی نہیں بلکہ ہماری خوشی میں بھی اس کی آنکھوں سے اشک چھلک پڑتے ہیں۔ماں کی انہیں سب خصوصیت کو بچوں کے ساتھ بڑوں کے دلوں میں پیوست کرنے کے لئے ایرج نے ماں کی عظمت کو موضوع بنا کر ایک سے بڑھ کر ایک عمدہ وشیریں اشعار کہے ہیں جن میں سے کچھ کے عنوان 'مادر'، 'قلب مادر' اور 'مہر مادر' ہیں انکے علاوہ بھی کلیات میں جا بجا ماں کی بڑائی کو بیان کرتے ہوئے اشعار موجود ہیں۔

ایرج نے ماں کی محبت میں اشعار کہے ہیں ہے۔''قلب مادر'' میں ایرج نے ماں کی محبت کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ موت کے بعد بھی ماں کی کا دل اپنے لخت جگر کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔اس نظم میں معشوقہ عاشق سے کہتی ہے کہ وہ اگر اس سے سچی محبت کرتا ہے تو اس کے لئے اپنی ماں کا دل لے آئے۔چنانچہ وہ فرزند نافرمان وسنگدل جس وقت اپنی ماں کا کلیجا لیکر چلا جارہا تھا تو نا گہانی طور پر اس کو ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر گر گیا۔اس کے معمولی ٹھوکر لگنے پر بھی اس ماں کا کلیجا تڑپ اٹھا جس کے ساتھ اس کے بیٹے نے ظلم کی ساری حدیں پار کردی تھیں اور وہ ممتا بھرا دل پکار اٹھتا ہے کہ اے میرے لخت جگر تجھے کچھ ہوا تو نہیں۔اس ممتا بھرے دل کی عکاسی ایرج نے نہایت سلیس، سادہ اور خوبصورت انداز میں کی ہے کہ جسے پڑھ کر آنکھوں سے آنسوں نکل پڑتے ہیں۔اس دل

گداز قطعہ کے چند اشعار کچھ یوں ہیں:

رفت و مادر را افگند بہ خاک سینہ بدرید و دل آورد بہ چنگ
قصد سر منزلِ معشوق نمود دل مادر بہ کفش چون نارنگ
از قضا خورد دَمِ در بہ زمین و اندکی سودہ شد اورا آرنگ
وان دلِ گرم کہ جان داشت ھنوز افتاد از کفِ آن بی فرھنگ
از زمین باز چو برخاست نمود پی برداشتنِ آن آھنگ
دیدکز آن دلِ آغشتہ بہ خون آید آھستہ برون ایں آھنگ
آہ دست ِپسرم یافت خراش آخ پایِ پسرم خورد بہ سنگ (۱)

جہاں ''قلب مادر'' میں ممتا پر عشق غالب ہوتا وہیں دوسری طرف ایرج نے نظم ''مادر'' میں ماں کی عظمت واسکی بڑائی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ہمیں اس کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ ماں وہ ہوتی ہے جو اپنے بچوں کے لئے اپنی ساری زندگی قربان کر دیتی ہے انکے آرام وسکون کے لئے اپنے آرام وسکون کو فراموش کر دیتی ہے۔ وہ ماں کی ہی ذات ہوتی ہے جو راتوں کو بیدار ہو کر اپنے لخت جگر کو لوری گا کر سلاتی ہے۔ انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتی ہے اور کلی کی مانند مسکرانا سکھاتی ہے اس نظم کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے:

گویند مرا چو زاد مادر پستان بدھن گرفتن آموخت
شب ھا بر گاھوارہ من بیدار نشست و خفتن آموخت
دسم بگرفت و پا بہ پا برد تا شیوہ راہ رفتن آموخت
یک حرف و دو حرف بر زبانم الفاظ نھاد و گفتن آموخت
لبخند نھاد بر لب من بر غنچہ گل شگفتن آموخت
پس ھستی من زھستی او ست تا ھستم و ھست دارمش دوست(۲)

بالا نظم کی اہمیت ومقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزی کے مشہور مورخ اے جی براون نے اپنی ماں کی محبت کی یاد میں اتاریخ کی معروف کتاب ''تاریخ ادبیات ایران'' میں اس پوری نظم کو سرفہرست میں جگہ دی ہے۔

جس بچہ کو ماں نے بچپن میں ہر طرح سے آسودہ رکھا اس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورتوں کو پورا کیا وہی بچہ بڑا ہو کر اپنی مہربان ماں کو اذیت دے رہا ہے اس بات سے بیخبر کہ اس کی اس حرکت سے بیچاری ماں کا دل غموں سے چور ہو رہا ہے۔ اپنی باتوں سے اس نے اپنے جان نثار کرنے والے پدر کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا اور انہیں بھی غم اٹھانے کے لئے مجبور کر دیا۔ اولاد چاہے کتنی ہی بد ہو اور والدین کے ساتھ چاہے کتنا ہی برا رویہ اختیار کرے لیکن اس مہربان ماں کے دل سے کبھی بھی اس کے لئے بد دعا نہیں نکلتی وہ کبھی بھی اسے اپنے دل سے دور نہیں کرتی:

رنج کشد مادر از جفای پسر لیک آنچہ کشیدست ھیچ رنج نداند
رنج پسر بیشتر کشد پدر، امّا چون پسر آدم نشد ز خویش براند
مادر بیچارہ ھر چہ طفل کند بد راندن او را ز خویشتن نتواند
شیرہ جان گر بود بہ کاسۂ مادر زان نچشد تا بہ طفل خود نچشاند(۳)

انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں جس کا ذکر ایرج نے ''مہر مادر'' میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان حیوانات سے محبت کرنا سکھیں۔ ایرج نے بتایا ہے کہ جب پرندے کا بچہ شکار کرتے ہوئے کسی مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو فوراً ہی ماں اس کی مدد کو آ پہنچتی ہے اور اسے بچانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ اس کے خوف کو دور کرتے ہوئے اس کے شکار کو آسان بناتی ہے۔ مادر مرغ کی ان ساری باتوں کا ذکر شاعر بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ سادہ و آسان زبان میں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہماری جان ہماری ماؤں پر قربان ہو جائے:

باز چون چوجہ ماکیان بیند — از پی صید بر گشاید پر
تند و تیز از ھوا بہ زیر آید — ھمچو حکم قضا و پیک قدر
ماکیانی کہ در برابر باز — نبود غیر عاجزی مضطر
خطر طفل خویش چون بیند — باد ناردد از ھیچ گونہ خطر
از جگر بر گشاید آوازی — کہ نیوشندہ را خلد بہ جگر
بجھد تا بہ پیش چنگل باز — بال کوبان فراز یکدیگر
باز چون بیند این تھور مرغ — کار مشکل نمایدش بہ نظر
بہ گذرد زین شکار قدری صعب — در ھوای شکاری آسان تر
این چنین می کند حراست طفل — مادر مہربان مہر آور
پس روا باشد ار کنند اطفال — جان بہ قربان مہر مادر(۴)

ماں کی عظمت کو بتاتے ہوئے ایرج کہتے ہیں کہ اے بیٹے آج تم جس مقام پر ہو آرام و آسودگی سے زندگی بسر کر رہے ہو کیا تمہے اس بات کی خبر ہے کہ تمہارے تولد کے وقت تمہاری ماں نے کتنی تکلیف اٹھائی حتٰی کہ اسے اپنی موت سے سامنا کرنا پڑا۔ اس نے نہ جانے کتنی ہی راتیں بیداری میں گزار دیں تا کہ تم آرام و سکون سے سو جاؤ۔ جب تک تمہارے اندر کسی چیز کا شعور نہیں آ جاتا وہ شب و روز تمہارے پیچھے قربان کر دیتی ہی:

بہ وقت زادن تو مرگ خود را — بگیرد در نظرہ بیچارہ مادر
برای این کہ شب راحت بخوابی — نخوابد تا سحر بیچارہ مادر
دو سال از گریہ روز و شب تو — نداند خواب و خوربیچارہ مادر
چوں دندان آوری رنجور گردی — کشد رنج دگر بیچارہ مادر
سپس چوں پا گرفتی ، تا نیفتی — خورد غم بیشتر بیچارہ مادر
تو تا یک مختصر جانی بگیری — کند جان ، مختصر بیچارہ مادر
بہ مکتب چوں روی تا باز گردی — بود چشمش بہ در بیچارہ مادر
و گر یک ربع ساعت دیر آیی — شود از خود بِدَر بیچارہ مادر
نبیند ھیچ کس زحمت بہ دنیا — ز مادر بیشتر ، بیچارہ مادر
تمام حاصلش از زحمت اینست — کہ دارد یک پسر بیچارہ مادر(۵)

نظامی گنجوی نے مثنوی ''خسرو شیریں'' میں اپنے ہفت سالہ بیٹے کو پند و نصیحت کی ہے۔ اسی طرز پر ایرج نے ''نصیحت بہ

فرزند'' عنوان سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں اپنے چہار سالہ فرزند کو نصیحت کی ہے۔حالانکہ ایرج نے یہ نظم اپنے بیٹے کو خطاب کرتے ہوئے کہی ہے پھر بھی ان کا کلام قوم کے تمام فرزندوں کے لئے ہے۔اس میں ایرج نے بتایا ہے کہ بچے والدین کے لئے اس دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہوتے ہیں۔کہتے ہیں کہ اگر چہ کوئی بچہ کم شکل وصورت کا بھی ہوتا ہے پھر بھی وہ اپنے والدین کی نظر میں دنیا کا سب سے خوبصورت بچہ ہوتا ہے۔خاص طور پر اپنی ماں کے لئے تو آنکھوں کا نور ہوتا ہے ایرج بچوں اور نوجوانوں کو زندگی جینے کا بہترین راستہ بتاتے ہیں اووہ چاہتے ہیں کہ بچے سحر خیز ہوں،خودکو پاکیزہ رکھیں:

از مال جہاں ز کہنہ و نو دارم پسری بہ نام خسرو
ھر چند کہ سال او چھار است پیداست کہ طفل ھوشیار است
ھر چند کہ طفل زشت باشد در چشم پدر بھشت باشد
آری مثل است کہ قر نبی در دیدۂ مادر است حسنا
ھان ای پسر عزیز دلبند بشنو ز پدر نصیحتی چند
ز ایں گفتہ سعادت تو جویم پس یاد بگیر ھر چہ گویم
می باش بہ عمر خود سحر خیز و ز خواب سحرگھان پرھیز
اندر نفس سحر نشاطی است کان را باروح ارتباطی است
دریاب سحر کنار جو را پاکیزہ بشوی دست و رو را
گر جامہ گلیم یا کہ دیباست چون پاک و تمیز بود زیباست
چون غیر بہ پیش خویش بینی انگشت مبر بہ گوش و بینی
با مادر خویش مھربان باش آمادہ خدمتش بہ جان باش
با چشم ادب نگر پدر را از گفتہ او مپیچ سر را
چون با ادب و تمیز باشی پیش ھمہ کس عزیز باشی
من می روم و تو ماند خواھی وین دفتر درس خواند خواھی(۶)

''ایرج کی سب سے بڑی صفت انکی سادگی زبان ہے،جسے سہل ممتنع کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔وہ نامانوس الفاظ اور مشکل ترکیبوں سے بچتے ہیں،اور اکثر ایسے کلمات استعمال کرتے ہیں،جن کا عام بول چال سے تعلق ہے۔'' (۷)

ماں کی ممتا ایسا موضوع ہے جو کہ ایرج کے علاوہ دیگر شعرا کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔بطور مثال چند شاعر و شاعرہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔مثلاً پروین اعتصامی کہتی ہیں کہ کسی بھی بچہ کی پہلی درسگاہ اس کا گھر ہوتا ہے اور ماں اسکی اولین استاد ہوتی ہے۔دنیا میں جتنی بھی بزرگ ہستیاں گزری ہیں مثلاً ارسطو،افلاطون،سقراط،لقمان وغیرہ نے اسی مکتب میں یعنی اپنی ماں سے پہلا درس حاصل کیا ہے۔ان کی کامیابی وکامرانی کے پیچھے ان کی ماں کا ہی ہاتھ رہا ہے۔اس مدرسہ میں زاہد وفقیہ اور سالک و پہلوان سب ایک شاگرد کی مانند ہوتے ہیں۔پروین اعتصامی نے ''فرشتہ انس'' میں ان تمام باتوں کا بخوبی ذکر کیا ہے۔چنانچہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اگر فلاطن و سقراط بودہ اند بزرگ بزرگ بودہ پرستار خردی ایشاں
بگاھوارہ ی مادر، بکودکی بس خفت سپس بمکتب حکمت، حکیم شد لقمان
چہ پھلوان و چہ سالک و چہ زاھد و چہ فقیہ شدند یکسرہ ، شگرد این دبیرستان (۸)

فروغ فرخزاد جدید شاعری میں ایسا نام ہے جو اپنی بے باک شاعری کی جہ سے مشہور ہے۔اس کے باوجود انہوں نے ممتا کے جذبے سے پر اشعار کہے ہیں کیونکہ وہ ایک عورت تھی اور ایک ماں کا دل رکھتی تھی۔وہ ماں جو اپنے بچے کے ہر خوف کو دور کر دینا چاہتی ہے خاص طور پر رات میں بچے زیادہ خوف زدہ ہوتے ہیں تو ماں انہیں لوری گا کر سلاتی ہے تا کہ اس کے لخت جگر کے سارے ڈر دور ہو جائیں اور وہ چین کی نیند سو سکے۔چنانچہ ''دیو شب'' میں فروغ کا ممتا بھرا دل پوری طرح عیاں ہے:

لای لای ، ای پسر کوچک من دیدہ بربند کہ شب آمدہ است
دیدہ بربند کہ این دیو سیاہ خون بکف خندہ بلب آمدہ است
سر بدامان من خستہ گذار گوش کن بانگ قدمھایش را
کمر نارون پیر شکست تا کہ بگذاشت بر آن پایش را
آہ ، بگذار کہ بر پنجرہ ھا پردہ ھا را بکشم سر تا سر
با دو صد چشم پر از آتش و خون میکشد دمبدم از پنجرہ سر
از شرار نفسش بود کہ سوخت مرد چوپان بدل دشت خموش
وای ، آرام کہ این زنگی مست پشت در دادہ بآوای تو گوش
یادم آید کہ چو طفلی شیطان مادر خستہ خود را آزرد
دیو شب از دل تاریکی ھا بیخبر آمد وطفلک را برد (۹)

شہریار نے بھی اپنی ماں کی یاد میں چند شعر ''ای وای مادرم'' کے عنوان سے کہے ہیں۔انہوں نے بتایا ہے کہ ماں نہیں ہے پھر بھی اس کے ہونے کا احساس گھر کے ہر گوشہ سے ہو رہا ہے۔ہر روز وہ میرے قریب سے گزرتی ہے میرا حال چال پوچھتی ہے اگر چہ وہ اب زندہ نہیں ہے۔چند اشعار پیش ہیں:

آہستہ باز از بغل پلہ ھا گذشت
در فکر آش و سبزی بیماری خویش بود
امّا گرفتہ دور و برش ھالہ ای سیاہ
او مردہ است و باز پرستار حال ماست
در زندگی ماھمہ جا وول میخورد
ہر کنج خانہ صحنہ ای از داستان اوست
در ختم خویش ہم بسر کار خویش بود
بیچارہ مادرم

ہر روز میگذشت از این زیر پلہ ھا
آھستہ ، تا بھم نزند خواب نازمن
امروز ھم گذشت
در باز و بستہ شد

با پشت خم ازایں بغل کوچہ میرود
چادرنماز فلفلی انداختہ برخ
کفش چروک خوردہ وجوراب وصلہ دار
او فکر بچہ ھاست
ھر جا شدہ ھو پیچ ھم امروز میخورد
بیچارہ پیرزن! ھمہ برف است کوچہ ھا(۱۰)

مجموعی طور پر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایرج میرزا دورہ جدید کے وہ یکتا شاعر ہیں جنکی نسبت شاہی خاندان سے تھی۔ پھر بھی ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہی سبب رہا کہ ایرج نے اپنی شاعری میں ایک شہزادہ ہونے کے باوجود بھی ماں کے متعلق اتنے بہتر اور بچوں کے لئے پر اثر اشعار کہے ہیں۔ تا کہ ہر دل میں محبت مادر اور اس کی عظمت کو دلنشیں کرا سکیں اور انداز بیان سادہ و عام زبان میں ہونے کی وجہ اپنے معاصرین میں سبقت لے جاتے ہیں۔ اپنی تمام زندگی اپنے کلام کی مانند سادگی میں گزاردی ۔ ایرج نے نہ صرف اپنے زمانے کو متاثر کیا بلکہ بعد کے شعراء کے لئے بھی گرانقدر سرمایہ فکر چھوڑا ہے انکی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نہ صرف ایرانی بلکہ دوسرے مما لک میں بھی جہاں فارسی جاننے والے لوگ موجود ہیں ان کی شاعری کو احترام وعقیدت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ بقول بہار مشہدی:

سعدیٔ نو بود و چون سعدی بہ دھر شعر نو آورد ایرج میرزا (۱۱)

منابع و مآخذ:

(۱) دیوان کامل یرج میرزا، محمد جعفر مجوب، ص، ۱۹۲

(۲) ایضاً، ص، ۱۶۷

(۳) ایضاً، ص، ۱۷۷

(۴) ایضاً، ص، ۱۸۷

(۵) ایضاً، ص، ۱۹۰، ۱۸۹

(۶) یضاً، ص، ۱۳۹، ۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶

(۷) جدید فارسی شاعری، منیب الرحمٰن، ص ۴۱

(۸) دیوان اشعار پروین اعتصامی، ص، ۱۶۲

(۹) دکتر منیب الرحمٰن ۔ برگزیدہ شعر فارسی معاصر جلد اول، ص، ۱۷۷

(۱۰) دکتر منیب الرحمٰن، برگزیدہ شعر فارسی معاصر جلد اول، ص، ۱۴۹

(۱۱) دیوان ملک الشعراء بہار، جلد دوم، ص، ۴۵۸

* دربارۂ زندگانی ایرج میرزا: (۱) کلیات دیوان ایرج میرزا از خسرو ایرج، (۲) دیوان کامل ایرج میرزا از محمد جعفر مجوب، (۳) سخنوران نامی معاصر ایران، جلد اول از سید محمد باقر برقعی، (۴) سخنوران ایران در عصر حاضر، جلد اول از محمد اسحاق، (۵) ایرانی ادب از ظہور الدین احمد، (۶) عصری فارسی شاعری و شعراء از سید احسن الظفر، (۷) جدید فارسی شاعری از منیب الرحمٰن، (۸) ادبیات ایران نو از محمد طاہر فاروقی

آزاد حسین
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بساط الغنائم کا ایک تجزیاتی مطالعہ

لچھمی نارائن شفیقؔ اورنگ آبادی اٹھارہویں صدی عیسوی کا ایک مشہور نام ہے۔ جس نے فارسی ادب کے مختلف میدانوں مثلاً تذکرہ نگاری، تاریخ نویسی، شعروسخن میں تاریخ گوئی، غزل گوئی، مثنوی نگاری، رباعی گوئی وغیرہ میں نا قابل فراموش کارنامے انجام دیئے جس کے نتیجے میں محققین ادب آج بھی ان کے کارناموں سے استفادہ کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کر تے ہیں۔

بساط الغنائم لچھمی نرائن شفیقؔ اورنگ آبادی کے کارناموں میں سے مراٹھوں کی تاریخ کے موضوع پر ایک اہم اور معتد بہ کارنامہ ہے۔ اس کا نام بھی شفیق نے تاریخی رکھا جیسا کہ اس کے شمار اعداد سے ۱۲۱۴ھ برآمد ہوتا ہے اور یہی اس کی سال تصنیف ہے جس کا ذکر شفیقؔ نے نسخے کی ابتداء میں یوں کی ہے:

''درین اوقات همایون واعیان مسرت مشحون که از شهور سنه یکهزار و دو صد و چهارده هجر یہٗ مقدسه حضرت نبی صلی اللہ علیه وسلم بقدر ثلث حصهٔ سال منقضی گشته لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی الاصل را که روشناس ارباب کمال است ولیل ونهار در تسوید وتبییض اوراق حالات هر ناحیه و دیار مصروف.''[۱]

شفیقؔ کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات گردش کرتی رہی کہ مرہٹوں کے احوال وواقعات کے موضوع پر شستہ اور سادہ عبارت میں کچھ لکھا جائے چونکہ مرہٹوں نے اکثر اوقات رؤساء دکن سے وابستگی رکھی اور بعض اوقات تو ان کے شریک بھی رہے۔ شفیقؔ کا مقصد اس سے صرف یہ تھا کہ قرب وبعد کی وجہ سے کوئی ان سے نا آشنا نہ رہے۔ باوجود کئی بار ہمت جٹانے کے وہ اس کام کو نہ کر سکے ۔ بالآخر سر جان ملکم جو اس وقت حیدر آباد میں موجود تھے ان کی فرمائش پر اس کام کو پائے تکمیل تک پہنچایا۔ اس کا نام 'بساط الغنائم' رکھا۔ جس کا موضوع تاریخ ہے۔ خود لکھتے ہیں:

''درخاطر گذشت که انموذجی در احوال مرهٹه ها که شریک غالب روساء دکن بلکه کل رئیس اند پرداخته آید و کارنامهٔ مصفا بعبارت ساده و شسته در کیفیات نفس الامری ساخته گردد تا موجب یادگار دور ونزدیک باشد. از آنجا که این خیال او مدت پیرامون دل میگشت شادمانی را وقت خوش شد و خورمی برخویش بالید. آستین تردد بر ساعد شکستم و کمر همت بر میان جان بستم. چون این نامه بذکر غنیم است بہ 'بساط الغنائم' که از سنه تالیف خبر میدهد موسوم کردم باللہ ولی التوفیق.''[۲]

نسخے کی ابتداء مندرجہ شعر سے ہوتی ہے:

اللہ اللہ این نوید آمد بگوش — میرساند مژدهٔ تازه سروش

اس مختصر ذکر کے بعد مؤلف کتاب نے کتاب کی وجہ تالیف اور اقوام مرہٹہ کا ذکر کیا ہے۔ تمہید تالیف کتاب کے ضمن میں مؤلف کتاب نے تاریخ نویسی کی اہمیت اور واقعات وحالات بیان کرنے کو دشوار اور مشکل امر کہا ہے۔ مورخ کو صادق وامین ہونا ضروری ہے، اپنے نفع اور فائدے کی امید میں تمام خوف وحزن اور عوام الناس کے مقصد کو بالائے طاق نہ رکھے اور حق کی تاویل میں پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دے۔ اپنے فائدے کو مدنظر رکھ کر کسی کی خوشامد اور چاپلوسی سے کام نہ لے۔ ایک مورخ کو ایسا بھی

نہیں ہونا چاہئے کہ اپنے دین و مذہب کی بنیاد پر اچھے برے کی تمیز نہ کر سکے۔ جس کی تائید میں چند اشعار بھی پیش کئے ہیں۔

''شیوۂ تاریخ نویسی از شیوہ ھای عمدہ روزگار است وطریقہ وقائع نگاری واقعی بہ غایت دشوار. چہ مورخ امین موتمن صادق القول گزیدہ سخن باشد بامید نفع وخوف ضرر وتعصّب ورعایت طرف از جادۂ صداقت کیشی ھا فراتر گذاشتہ بتاویل وحق پوشی نگراید وحسن معاملہ بہ قبیح بدل نہ نماید ورعایت تفصیل یکی بر دیگری منظورش نباشد وبناء بر جلب منفعت کاری راجداری وخوشامد نفر ماید و بسبب اختلاف دین وایمان زشت وزیبا را نشناسد''[۳]

ھیچ کس نیست ز زیبا و زشت کش نہ حکیم از پی کاری سرشت
زشت نہ بی مصلحت آراستند مصلحت است اینکہ چنین خواستند

لچھمی نرائن شفیقؔ جیسا کہ قبلاً ذکر کیا گیا ایک نامور مورخ ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کے آداب و رسوم سے بھی بہت اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی اس کتاب میں تاریخ نویسی کے آداب سے بھی روشناس کیا ہے کہ تاریخ لکھتے وقت بے جا کسی کی طرفداری نہ کی جائے اور نہ ہی کسی قوم یا ملت کے فرد یا ان سے وابستہ واقعات کے بیان میں رکیک الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ جس کی شہادت اس نے نعمت خان عالی کے چند اشعار پیش کر کے مزید پختہ بنانے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ مورخین اسلام اور حدیث نبوی کی بھی استشہاد پیش کیا ہے لکھتا ہے:

''ارباب نظر می دانند کہ تاریخ نویسان اسلامی در تحریرات خود طرف ممانعت راپچہ تحقیری نگارند و چہا کلمات ناملایم والفاظ رکیک نسبت یا جانب بزبان قلم می آرند.وحدیث شریف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم خذ ماصفا ودع ما کدر از خاطر محو میسازند''[۴]

مصنف کتاب نے 'بساط الغنائم' میں مرہٹوں کی تاریخ لکھنے والوں پر چبھتے ہوئے انداز میں وار بھی کیا ہے جس کا مطلب صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مرہٹوں کی تاریخ لکھنے والوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ جن مورخین نے بھی ان کے متعلق لکھا ان کے حرکات لغو، کو صفات حسنہ کی شکل میں پیش کیا۔ شفیقؔ کا خود بیان ہے کہ میں ان لوگوں کے متعلق (مرہٹوں) جو مختلف قوموں کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی تعداد تقریباً ستر سے زائد کے آس پاس پہنچتی ہے۔ ان کی زبان و حال سے واقف لوگوں سے جو تحقیقات ہم تک پہنچی ہے اس کی روشنی میں، میں ان کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ بیان کرتے ہیں:

''کارنامہ ھای کہ مرھٹہ ھا در اقتدار خود کردہ اند فارسی نویسان متقدمین ومتاخرین یک قلم ترک دادہ وحمل بر استغراق و مبالغہ می نمایند.وکسانی کہ بہ تحریر پرداختہ اند حرکات لغو را باصفات مرقوم ساختہ اند.راقم سطور حالات این گروہ را کہ باقوام مختلفہ مشتھر اند و تعداد از ھفتاد متجاوز میگویند از زبان دانان و واقف حالان ھر قدر بہ تحقیقات رسید بہ تحریر می آرم واز امور عجیب وغریب ومعلومات دیگر نمی گذرم ونمی گذارم''[۵]

اس کے بعد صاحب کتاب نے ہندو قوم جو اپنی ذات و نسل کی بنیاد پر متعدد فرقوں میں منقسم ہیں ان تمام کی بنیاد کو صرف چار ذاتوں پر قائم کیا ہے۔ شفیقؔ کے قول کے مطابق ان کو ''چار چوترن'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ان تمام کے آبائی پیشے کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، جس کی گنجائش اس مختصر میں نہیں ہے صرف ان کے نام پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے۔ وہ چار یہ ہیں:

اوّل برہمن، دوم چھتری، سوم بیش، چہارم سودر۔

قوم مرہٹہ: مرہٹہ قوم کے متعلق صاحب کتاب کا جو بیان ہے اس کے مطابق مرہٹہ وہ لوگ ہیں جو سرزمین مرہٹ میں سکونت پذیر ہیں۔ اور مرہٹ کا علاقہ اورنگ آباد، قلعہ دیوگیر اور اس کے مضافاتی علاقے کو قرار دیا ہے۔ مرہٹہ قوم کی ستر قسمیں شفیقؔ نے 'بساط الغنائم' میں بیان کی ہیں ساتھ ہی اس بات کا بھی امکان ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہوں لیکن ان کے متعلق تشفی بخش

اطلاعات فراہم نہ ہونے کی وجہ سے صرف ستر کے ہی ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ان کے عادات و رسوم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان میں اسے ہر ایک کے اکثر عادات و رسوم ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن بعض ملتی جلتی بھی ہیں۔کھانے پینے میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن قرابت و مصاہرت سے آپس میں احتراز ہے۔جیسا کہ 'بساط الغنائم' کی عبارت سے عیاں ہے:

''القصہ قوم مرہٹہ کہ عبارت از سکنہ سرزین مرھٹ است او ین خطہ درزمان حال بصوبۂ خجستہ بنیاد اورنگ آباد نامزد و قلعہ دیوگیر یعنی دولت آباد از مضافات آن است ھفتاد قسم از اقوام مرہٹہ معلوم گردید و سوائ آن ھم ھست احاطۂ آن دشوار وھر یک در رسوم و عادت خویش متفرد می باشد و در بعضی چیزھا متحد اگر چہ در طعام خوردن شریک ھمدیگر اند اما اجتنابی از قرابت و مصاھرت دارند تفصیل اسمھای اقوام ایشان پرداختہ سخن را ایجاز میسازم''[6]

ان تمام میں سب سے پہلی قوم جس کا ذکر شفیق نے کیا ہے وہ قوم ''بھوسلہ'' ہے۔یہی اس قوم کے بانی تھے،اس کی وجہ تسمیہ کے ساتھ اس کے اختلاف کو بھی پیش کیا ہے چونکہ بعض لوگ ''بھوسرہ'' بھی کہتے ہیں۔دونوں نے اپنی اپنی دلیلیں پیش کی ہیں۔جن کا نظریہ یہ ہے کہ اس قوم کا نام 'بھوسلہ' ہے وہ اپنی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'بھو' کے معنی ہندی زبان میں زمین کے ہوتے ہیں 'وسلہ' بمعنی خار و پیکان کے ہوتا ہے جو سال کا مخفف ہے اکثر راجاؤں کے نام کے ساتھ بھی اس کا استعمال ہوتا رہا ہے۔جیسے بیری سال، درجن سال، شترسال اور یہ تینوں لفظ سنسکرت زبان میں دشمن کے معنی میں آیا ہے۔یعنی اس قوم کو صحرا اور بیابان زیادہ محبوب تھے اور یہ لوگ اپنے اکثر اوقات دشمنوں سے جنگ و جدال میں صرف کرتے تھے اسی بناء پر ان کا نام 'بھوسلہ' رکھا گیا۔شفیق نے لکھا ہے:

''آنانکہ بھوسلہ میدانند چنین تقریری کنند کہ بھو در زبان ہندی بمعنی زمین وسلہ بمعنی خار و پیکان آمدہ سلہ مخفف سال است و این لفظ درنامھای راجھا اکثر می باشد چنانچہ بیری سال و درجن سال و شترسال وھر سہ لفظ بزبان سنسکرت بمعنی دشمن آمدہ یعنی خار دشمن بالجملہ چون مقتدای بھوسلہ قزاقی وصحرا نوردی واعداکشی داشت نامش بھوسلہ گذاشتند یعنی کہ خلش زمین''[7]

ایک جماعت انھیں 'گھونسلہ' کے نام سے بھی یاد کرتی ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ لوگ خانہ بدوشوں کے مانند اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔کسی بھی جگہ پر اپنا ایک مختصر سا مکان بنا لیتے اور اسی میں زندگی کے شب و روز بسر کیا کرتے تھے اور یہ طریقۂ زندگی بھی ان کا عورتوں سے عشق کی بنا پر تھا جہاں عشق و معاشقہ کا معاملہ ہموار ہو گیا وہیں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔شفیق بساط الغنائم میں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''وکسانی کہ بہ گھونسلہ تعبیر می نمایند،معنی گھونسلہ بہ زبان مرھٹی آشیانہ کوچک می دانند سرگروہ ایشان بناء بر تعشق زن کہ ظاھراً از غیر قوم بشھرت خانہ باشد جائ مکانی مختصر ساختہ پنھان برسویت داشت بہ گھونسلہ مشتھر شد''[8]

تیسرا اور آخری گروہ جو 'بھوسرہ' کہتا ہے انھوں نے بڑی قبیح اور عجیب و غریب دلیل پیش کی ہے۔ان کے مطابق 'بھوسرہ' ہندی زبان میں ملک بضعہ یعنی فرج کو کہتے ہیں۔اپنی عادات و اطوار کے مطابق شب و روز عورتوں کے کے عشق میں محو رہا کرتے تھے اس لئے فرج زنان سے ان کو منسوب کرتے ہوئے ان کا نام 'بھوسرہ' رکھ دیا گیا۔خود بساط الغنائم کی عبارت ہے:

''وگروھی بہ بھوسرہ نسبت می دھند توجیھی عجیب بیان می کنند کہ بھوسرہ درھندی بہ معنی فرج است از آنجا کہ مشغوف عشق زنی شب و روز بودھم قومش نسبت او بہ فرج دادہ از راہ استھزاء باھم تکلم می کردند تا آنکہ رفتہ رفتہ راء مھملہ موافق قاعدۂ ھندی مثل کوارن و گوالن تبدیل بہ لام یافتہ بھوسلہ شد واللہ اعلم''[9]

صاحب تاریخ مآثر الامراء نے ایک جدید توجیہ پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ راجہ ساہو چتور کے راجہ کے خاندان اور

سسو دیہ قوم سے تھے۔ چند وجوہات کی بنیا پر وہ چتور سے دکن چلے گئے اور پرگنہ کرکنل کے موضع 'بھوسہ' میں سکونت اختیار کر لی اسی موضع کی نسبت سے 'بھوسلہ' کہلائے۔ان کے تعلقات ادیپور کے راجہ سے بھی تھے جو سسو دیہ تھے ان راجپوتانہ علاقے کے تمام راجاؤں پر ادیپور کے راجاؤں کو فوقیت اور اہمیت دی جاتی تھی، ان کا یہ بھی ایک معمول تھا کہ علاقے کی جو بھی حکومتیں تھیں ان میں جب بھی کوئی نیا راجہ آتا تو راجہ ادیپور کی طرف سے قشقہ بھیجا جاتا تھا جو کسی آدمی کے خون کا ہوتا تھا جس سے وہ باعث افتخار سمجھتے تھے۔ادیپور کے راجاؤں کا لقب 'رانا' ہوتا تھا۔ یہ لوگ سسو دیہ ہونے کی وجہ سے اپنے نسب کو نوشیروان عادل سے منسوب کرتے ہیں۔

''صاحب مآثر الامراء جدید می نویسد کہ راجہ ساھو بھوسلہ ازنسلہ راجھائ چتور است کہ سسو دیہ انداز نیکانش راجہ سورسین نام بنابر وجھی از چتور بدکن رفتہ چندی موضع بھوسہ عملہ پرگنہ کرکنل سرکار پرنیدا صوبہ بخجستہ بنیاد سکوعنت گرفت ونسبت بہ آن موضع خود را بہ بھوسلہ براجھای اودیپور سسو دیہ اندمی رسد.وراجھای اودیپور فوق جمیع راجھای سرزمین راجپوتانہ انداز راجھای دیگر ھر راجھای کہ نو برمسند راج می نشیند راجہ اودیپور قشقہ برای اومی فرستد واو آن قشقہ افتخار را بر پیشانی ادب می کشد واورا قشقہ از خون آدمی می کشند .ولقب راجہ ادیپور رانا است واونسب خود بنوشیروان عادل می رساند شمہ از احوال خاندان کسریٰ بناء بر شادابی کلام نوشتن درین مقام مناسب افتاد''[۱۰]

شفیق نے نوشیروان عادل کے مختصر حالات کا بھی ذکر کیا ہے۔جس میں مورخین اسلامی کے حوالے سے سلاطین ساسانیان کا ذکر کیا ہے اور انھیں عجمی بادشاہوں کے طبقۂ چہارم کے زمرے میں شمار کرایا ہے جو اپنی شان وشوکت میں کیانی بادشاہوں کے ہم پلہ تھے اور اکثر ممالک ان کے باج گزار (Tax paee) تھے۔ان کا پہلا بادشاہ اردشیر بابکان اور آخری بادشاہ یزدجرد بن شہریار تھا۔بساط الغنائم کی عبارت کے مطابق چار سو ستائیس سال کی طویل مدت تک چھبیس بادشاہوں نے حکومت کی۔جس کی تفصیلات شاہنامہ فردوسی وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

نوشیروان عادل بھی اسی ساسانی عہد کا ایک مشہور و نامور بادشاہ گزرا ہے جو اپنے عدل وانصاف پرستی کی وجہ سے آج بھی دنیا میں زندہ وجاویدہ ہے باجود اس کے کہ اس کو دار فانی سے کوچ کئے ہوئے ایک عرصہ دراز ہو چکا ہے۔اسی نوشیروان عادل کے زمانے میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے عدل وانصاف کو اور حاتم طائی کی سخاوت کو یاد کیا جس کا ذکر شفیق نے اپنی اس کتاب 'بساط الغنائم' میں ذکر کیا ہے۔

''نوشیروان جھانداری بود عادل باذل گواہ عدالتش ھمین بس است کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث در زمانش شدہ اورا بہ عدالت یاد کرد و نیز فرمود کہ نوشیروان بنابر عدالت وحاتم طائی جھت سخاوت باوصف بودن در کفر از حرارت آتش دوزخ محفوظ خواھند ماند''[۱۱]

نوشیروان عادل اپنے عدل وانصاف کی وجہ سے اڑتالیس سال کی طویل مدت تک حکومت کی جس کا دائرۂ حکومت میں ترکستان، ماوراءالنہر، یمن، مصر اور دیار عرب کے علاوہ ہندوستان کے اکثر شہر و بلاد شامل تھے۔

نوشیروان عادل سے مراٹھوں نے اپنی نسبت اور حسب ونسب کیسے منسلک کیا، شفیق نے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے کہ نوشیروان عادل کے عہد میں مزدک زندیق نے نبوت کا دعوی کی اور ایک بڑے عالم جن کی تعداد تقریباً ۹۸ ہزار تھی گمراہ کر رکھا تھا، اس کو قتل کر دیا گیا۔اسی کے زمانے میں نوش زاد نامی لڑکا جو قیصر کی بیٹی کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور دین مجوسی کو ترک کر کے اس نے دین ترسایان کو قبول کیا اور اپنے لشکر کے ساتھ اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔نوشیروان نے رام برزین کو ایک عظیم لشکر کے ساتھ اس

سے جنگ کے لئے بھیجا جس میں نوش زاد مارا گیا۔لیکن اس کی اولادیں ہندوستان میں رہ گئیں ۔رانا راجہ اودیپور اسی نوش زاد کی اولاد سے ہیں جو اپنا حسب ونسب نوشیروان عادل سے منسوب کرتے ہیں۔

''درعھد نوشیروان مزدک زندیق کہ دعوی نبوت کردہ عالمی را گمراہ ساختہ بود مع توابع خود کہ نو دوھشت ھزار کس بودند بقتل رسید درزمانش نوش زاد پسر او کہ از بطن دختر قیصر بھمرسیدہ بود از دین مجوس برگشتہ بہ دین ترسایان گردید و بالشکر خود بہ ھندوستان رفت و در آنجا سپاہ گران جمع نمود وخواست کہ بہ ایران رود نوشیروان رام برزین را بالشکر عظیم بہ جنگ پسر فرستاد ونوش زاد بعد از محاربہ بہ قتل رسید و از و در ھندوستان اولاد بماندمی گویند کہ رانا راجہ ادیپور از نژاد نوش زاد استو در عھد نوشیروان خضا بمو بہ ھم رسید'' ۱۲

اس کے علاوہ اس کتاب میں اور بہت ساری تفصیلات مثلاً مرہٹوں کے احوال وکوائف کا ذکر ایک مرہٹی کتاب کے حوالے سے ،ولادت سیواجی بھوسلہ،عرضی شیواجی بعالمگیر بادشا،کیفیت آغاز ریاست سنبھا جی بعد وفات سیواجی پدرش،قوم بنجارا،رفقای سیواجی بھونسلہ،آغاز کیفیت مداخلت براھمہ کوکنی در دولت مرھٹہ بھوسلہ و برکنار گذاشتن آنھا را فقط بنام توزکی،تسلط بالاجی راو پسر باجی راو ابن بالاجی بن بشناتھ مذکور،فوج کشی عمادالملک باتفاق ھولکر و جی اپا جانب ملک جات،آمدن احمد شاہ ابدالی جانب ھندوستان وبقتل رساندن دتاجی پٹیل وسابا جی رواگریختن جنگو جی ستیند ھ وملھار ھولکر وغیرہ ملتی ہیں۔

شفیق نے اس کتاب کا نام 'بساط الغنایم' رکھااور اس کی تصنیف کا کا م ۱۹/جمادی الآخرہ ۱۲۱۴ ھ بمطابق ۱۸/نومبر ۱۷۹۹ء بروز دوشنبہ پائے تکمیل کو پہنچا۔اختتام پر قارئین سے مصنف کتاب طالب دعاء ہیں ۔آخر میں ایک قطعہ پیش کیا ہے جس سے تاریخ تصنیف کے علاوہ طالب دعا ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔

ھزار و دو صد و دہ چار ھجری شفیق من نوشت این ماجرای
کہ صاحبدلی روزی برحمت کند در حق این مسکین دعای

'بساط الغنائم' لچھمی نرائن شفیق کی یہ کتاب مرہٹوں کی تاریخ کے موضوع پر ایک اہم اور جامع کتاب ہے۔یہ کتاب ابھی تک قلمی نسخے کی شکل میں ہے اور مرحلۂ چاپ سے نہیں گزری ہے۔دریافت شدہ اطلاع کے مطابق اس کے دو نسخے مولانا آزاد لائبریری،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہیں اور ایک نسخہ حیدرآباد میں ہے اس کے علاوہ بیرون ملک کی برٹش میوزیم لائبریری میں بھی اس کا دو نسخہ موجود ہے۔

منابع وماخذ:

۱۔بساط الغنائم،شمارہ ۲۳۲ قلمی نسخہ،مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،ورق،۱ الف
۲۔ایضاً،ورق،۱،الف،ب
۳۔ایضاً،ورق،۱ الف
۴۔ایضاً،ورق،۲ الف
۵۔ایضاً،ورق،۲ ب
۶۔ایضاً،ورق،۳ الف
۷۔ایضاً،ورق،۴ الف
۸۔ایضاً،ورق،۴ الف،ب
۹۔ایضاً،ورق،۴ الف
۱۰۔ایضاً،ورق،۴ ب ورق ۵ الف
۱۱۔ایضاً،ورق،۵ ب
۱۲۔ایضاً،ورق،۶ الف

ڈاکٹر شفیق احمد
اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

بہمنی سلاطین اور فارسی زبان وادب

چکیدہ

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فارسی ادب ہند وایران کی مشترکہ تہذیب وتمدن کا ایک موثر سرچشمہ ہے جو عموماً سلاطین کے دربار سے وابستہ رہا ہے اور ان کی سرپرستی اور ادب نوازی کے سایہ میں پروان چڑھا ہے۔ گیارویں صدی میں محمود غزنوی کے اقتدار سے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا باقائدہ آغاز ہوا۔ اس دور میں لاہور کو علم وادب کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد دہلی میں جب غلامان کا دور حکومت شروع ہوا تو آہستہ آہستہ دہلی بھی علم وادب کا مرکز بن گیا اور فارسی کی نشوونما ہونے لگی۔ جب علاؤ الدین خلجی دکن پر حملہ آور ہوا تو اس کے بعد دکن میں بھی فارسی کے آثار وجود میں آنے لگے۔ محمد تغلق کے دور حکومت میں دکن میں بہمنی دور حکومت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کا آغاز ہو۔ دکن میں بہمنی دور حکومت کی بنیاد علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی نے ۱۳۴۷ء میلادی میں رکھی۔ بہمنی سلطنت دکن کی تاریخ کا ایک دلکش ودرخشاں باب ہے۔ دکن میں فارسی زبان وادب کی ترویج و ترقی میں بہمنیہ سلاطین کا اہم حصہ رہا ہے۔ سلطان علاؤ الدین حسن شاہ بذات خود علوم وفنون اور شعروسخن کا شیدائی تھا۔ اس سلسلہ کے سلاطین نہ فقط فارسی زبان وادب کے ساتھ شغف رکھتے تھے بلکہ شعر بھی کہتے تھے۔ سلاطین کے علاوہ شعراء وادباء نے بہمنی دربار میں فارسی زبان و ادب کی خدمات انجام دئے۔ جن میں سلطان فیروز شاہ بہمنی، سلطان محمد شاہ بہمنی، عصامی اور محمود گاواں قابل ذکر ہیں اور ان کی مفصل تفصیل مقالہ میں درج ہے۔

فارسی زبان وادب کا آغاز اور ہندوستان وایران کا رابطہ زمانہ قدیم سے ہی شروع تھا۔۔ بہت سے صوفیأ کرام عرب وایران سے اسلام کی خاطر ہندوستان آئے اور درس وتدریس کا کام شروع کیا اگر سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو محمود غزنوی سے پہلے بھی عربی اور ایرانی حکمران ہندوستان پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ لیکن گیارویں صدی میں محمود غزنوی کے اقتدار سے ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا باقائدہ آغاز ہوا۔ اس دور میں لاہور کو علم وادب کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد دہلی میں جب غلامان کا دور حکومت شروع ہوا تو آہستہ آہستہ دہلی بھی علم وادب کا مرکز بن گیا اور فارسی زبان وادب کی نشوونما ہونے لگی۔ جب علاؤ الدین خلجی دکن پر حملہ آور ہوا تو اس کے بعد دکن میں بھی فارسی کے آثار وجود میں آنے لگے۔ محمد تغلق کے دور حکومت میں دکن میں بہمنی دور حکومت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کا آغاز ہو۔

تاریخ فرشتہ میں درج ہے کہ علاؤ الدین حسن، گنگو برہمن کے دربار میں معمولی ملازم تھا اور گنگو برہمن غیاث الدین تغلق کے بیٹے محمد تغلق کا امیر خاص تھا۔ ایک دن علاؤ الدین نے اپنے آقا گنگو برہمن کے ساتھ تذکرہ معاش کیا۔ گنگو برہمن نے بنجر زمین کا کچھ حصہ، دو بیل اور دو مزدور کھیتی باڑی کے لئے دیئے اور انہوں نے وہاں جا کر کھیتی باڑی شروع کی۔ ایک دن کی بات ہے کہ مزدور زمین میں کھیتی باڑی کے لئے ہل جوت رہے تھے اچانک ہل کی نوک کو ایک زنجیر نے پکڑ لیا۔ جب وہاں سے کھودا گیا تو ایک بڑا برتن سونے کے سیکوں سے بھرا ہوا ملا۔ مزدوروں نے علاؤ الدین حسن کو آگاہ کیا۔ علاؤ الدین ایک ایماندار آدمی تھا اور

نہیں چاہتا تھا کہ ان سکوں کو کام میں لایا جائے۔ وہ سوچتا تھا کہ ایسا کرنے سے مالک کے ساتھ خیانت ہوگی۔ اس نے فوراً سکوں کے برتن کو اپنے مالک گنگو برہمن کے پاس پہنچادیا۔ گنگو برہمن نے یہ قصہ جوں کا توں محمد تغلق کے سامنے رکھا۔ شہزادے محمد تغلق کو یہ ماجرا دیکھ کر حیرت ہوئی اور اس نے یہ قصہ اپنے والد غیاث الدین تغلق کو سنایا۔ غیاث الدین تغلق، علاؤ الدین حسن کی ایمانداری سے متاثر ہوا، اس کی بہت تعریف کی، شاہانہ نوازشات سے سرفراز کیا اور اپنے بڑے امرا کی فہرست میں شامل کرلیا۔

کچھ عرصہ بعد جب محمد تغلق نے دکن کو فتح کرنا چاہا تو علاؤ الدین کو سپاہ سالار بنا کر فوج کی بڑی تعداد کے ساتھ دکن کی طرف روانہ کیا۔ دکن کی طرف فوج کشی کرنے کے بعد دو اور امیروں نے اس کے ساتھ مل کر تغلق سلطنت کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرایا۔ کچھ مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد دکن پر فتح یاب ہوئے۔ ان امرا میں علاؤ الدین سب سے قابل تھا جس کی وجہ سے علاؤ الدین کو ہی تخت نشین کیا گیا اسطرح دکن میں بہمنی دور حکومت کی بنیاد علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی نے ۱۳۴۷ء میلادی مین رکھی۔ لفظ گنگو بہمنی کیا ہے، علاؤ الدین حسن کے نام کے ساتھ لفظ گنگو بہمنی کیسے آیا بہت سے سوالات قاری کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یاد رہے تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ایک دن گنگو برہمن، علاؤ الدین حسن کے ساتھ گفتگو کررہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ آپ شایستہ کردار کے مالک ہیں اور یک دن بہت بلند مرتبہ حاصل کریں گے۔ پھر اپنا منہ علاؤ الدین کی طرف کیا اور وصیت کی کہ اگر خدا آپ کو کوئی بڑا عہدہ عطا فرمائے تو اپنے نام کے ساتھ میرا نام ضرور درج کرنا تاکہ میرا نام بھی ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید رہے۔ جب علاؤ الدین حسن دکن میں تخت نشین ہونے لگے تو اپنے آقا کی بات بھولے نہیں تھے۔ تب اس نے اپنے نام کے ساتھ گنگو برہمن کا نام درج کیا اور علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کہلانے لگے۔ اسی نام کی وجہ سے یہ دور بہمنی دور کہلانے لگا۔ اس دور حکومت میں اٹھارہ حکمرانوں نے تقریباً پونے دوسو سال تک حکومت کی۔ نہ فقط بہمنی حکمران فارسی زبان وادب کے ساتھ شغف رکھتے تھے بلکہ امراء اور وزراء بھی فارسی زبان وادب کے ساتھ ذوق وشوق رکھتے تھے۔ بہمنی سلاطین کا بیشتر وقت اگرچہ کشور کشائی میں گزرا پھر بھی بہمنی دور علماء وفضلاء کا مرکز تھا اور اس دور میں دکن کی سرزمین تاریخ نویسوں، صوفی حضرات، فلسفی، شعراء اور ادباء وغیرہ کی آماجگاہ بن گئی۔ ان بزرگوں نے یہاں آکر اپنے علم و روحانی فیضان سے نہ صرف اہل ملک کو متاثر کیا بلکہ بادشاہان وقت نے بھی ان سے روحانی استفادہ کیا۔ ان ادیبوں اور عالموں نے دکن کے علمی وادبی معیار کو بلند کیا اور ایک خاص علمی فضا قائم کی۔ اس دور میں فارسی زبان وادب کی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان حکمرانوں کی مادری زبان فارسی تھی اسی لئے فارسی زبان وادب دکن میں بہمنی دور میں آسمان کی بلندیوں تک پہنچی۔ افسوس کہ بہمنی دور کی فارسی زبان وادب کا بیشتر سرمایہ دستبرد زمانہ ہوگیا۔

تمام مورخین اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ بہمنی سلطنت دکن کی تاریخ کا ایک دلکش و درخشاں باب ہے دکن میں فارسی زبان وادب کی ترویج وترقی میں بہمنیہ سلاطین کا اہم حصہ رہا ہے۔ سلطان علاؤ الدین حسن شاہ بذات خود علوم وفنون اور شعر وسخن کا شیدائی تھا۔ اگرچہ حسن بہمن شاہ کا بیشتر وقت کشور کشائی اور تسخیر ممالک میں گذرا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے علوم وفنون اور ادب وشاعری کی آبیاری کی اپنی ادب نواز فیاضیوں سے دکن کو علم وادب کا گہوارہ بنادیا اور تعلیم کے فروغ کے لئے مدارس اور کتب خانوں کی بنیاد ڈالی۔

سلطان محمد شاہ ثانی بہمنی کے دور حکومت میں (۷۸۰ھ تا ۷۹۹ھ) اسلام کی راہ پر بہت روپے خرچ ہوئے۔ ان کا ماننا تھا کہ مجھے کوئی حق نہیں کہ حکومت کے روپے اپنے ذاتی خرچ کے لئے صرف کروں۔ اس نے پورا خزانہ مختلف جگہوں پر مساجد بنوانے، مدارس کھولنے، تالاب کھودنے اور دوسرے تعمیر وترقی کے کاموں پر خرچ کردیا۔ ان نئے تعمیر شدہ مدارس میں فارسی زبان و

ادب کا رواج عام کر دیا۔ یہ خود نہایت سلیم الطبع، عادل، خوش نویس، شاعر اور پابند شرع تھا۔ فارسی و عربی ادب کے ساتھ بہت شغف رکھتا تھا۔ یہ علماء و فضلاء کا بہت قدر دان تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے حافظ شیرازی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ حافظ کی معذرت لکھ بھیجنے پر ایک ہزار سکہ طلائی بطور تحفہ روانہ کئے۔ وہ الگ بات ہے کہ حافظ شیرازی کئی بار سفر ہند کا ارادہ کر کے بھی ہندوستان تشریف نہیں لا پائے۔ ان کو نہ فقط علم و ادب کا شوق تھا بلکہ فارسی زبان میں شعر بھی کہتا تھا۔ اس کے تین شعر حدائق السلاطین میں دستیاب ہیں۔ ابیات ملاحظہ ہوں:

عافیت در سینہ کار خون فاسد میکند — رخصتی ایدل کہ از الماس نشتر می خرم
خضر بد سود است در بیع متاع عافیت — می روم این جنس را از جائی دیگر می خورم

فرد ملاحظہ ہو:

آنجا کہ لطف دوست دہد منصب مراد — بخت سیاہ وطالع میمون برابر است

ان کے علاوہ سلطان فیروز شاہ بہمنی بھی ایک عالم دین تھا۔ یہ بہمنی سلاطین کا آٹھواں فرمانروا تھا۔ یہ ۸۰۰ھ میں تخت نشین ہوئے پچیس سال حکومت کرنے کے بعد ۸۲۵ھ یں انتقال کیا۔ اس کے متعلق قدیم تاریخیں بالا اتفاق رقمطراز ہیں کہ علم و ادب کے اعتبار سے شاہان بہمنیہ میں اس کا مد مقابل کوئی نہیں تھا علم تفسیر، اصول، حکمت اور فلسفہ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ یہ چند زبانیں جانتا تھا خصوصاً فارسی، عربی اور ترکی میں مہارت رکھتا تھا۔ اہل علم حضرات سے اکثر سرگرم صحبت رہتا تھا۔ متقدمین شعراء عرب و عجم کے اشعار و قصائد زبانی یاد تھے۔ کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا تھا۔ آغاز میں عروجی تخلص کرتا تھا اور تخت نشین ہونے کے بعد فیروزی تخلص اختیار کیا۔ صاحب دیوان تھا لیکن دیوان نادر الوجود ہے۔ مختلف تذکروں میں اشعار اور غزلیات درج ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

کرشمہ جنبش آموزاست مژگان درازش را — ستم کرداست واجب بر زبان تعلیم نازش را
محبت چاک بر دل می زند ہر گہہ کہ در بزمی — بخود مخصوص می بینم تغافل ہای نازش را
مباد آسیب نقصان یابد از سوز دلم یاری — بدل چو رہ دہم اندیشہ زلف درازش را
نہ یابد لذتی زاید زوصلت از متاع خلد — ہمان بہتر کہ در دامن کشد اجر نمازش را
عروجی قامت ورخسار آن خورشید تابان را — بہ سرو و لالہ می سنجد بہ بیند امتیازش را

جای دیگر رقم طراز ہے:

بدان مثابہ زغم دہر بر دلم تنگ است — کہ دل بہ لذت سودائی عشق در جنگ است
گل امید شگفتاز نسیم وعدہ ولی — ز آفتاب غم انتظار بے رنگ است
بہ قطع راہ محبت مخور فریب امید — کہ غایت ابدش ابتدائی فرسنگ است
بجز سرود محبت نہ کرد زمزمہ ناک — کہ ہر چہ خارج ازاین پردہ ننگ آہنگ است
دلی بہ سینہ لبالبز دوستیدارم — کہ پیش اہل جہان بی بہارتر از سنگ است
دماغ طبعر وجی چہ دلکشا چمنی است — چمن مگوی کہ این آسمان فرہنگ است

غزلیات کے علاوہ انہوں نے رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ رباعی ملاحظہ ہو:

در آتش ہر زہ فکر زائکنہ کنی — اندیشہ بہر خیال مائل نہ کنی

این نقد خزینہاست بگوش تا صرف بہ جنس ہائی باطل نہ کنی

سر زمین دکن میں بہمنی دور کے دوسرے سلاطین بھی شعر کہتے تھے مگر اس بات کا افسوس ہے کہ نہ فقط باقی سلاطین کا فارسی کلام زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو گیا بلکہ شعراء کا بھی بیشتر سرمایہ زمانہ موجود تک نہیں پہنچ پایا۔لیکن پھر بھی خوش بختی سے کچھ نمونے ہنوز دستیاب ہیں،جن میں ابوالملک عصامی کا شاہنامہ ''فتوح السلاطین''مکمل صورت میں ملتا ہے۔عصامی سلطان علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کا اولین و عظیم ترین شاعر تھا۔یہ نظام الدین اولیاء کا مرید تھا اسی کی پیروی کرتا اور ان سے بہت عقیدت رکھا تا تھا۔دکن کے اس علم پرور ماحول اور علمی و ادبی فضا میں عصامی نے اپنا شاہنامہ ''فتوح السلاطین'' تصنیف کیا جو سلطان علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کے دربار کی فارسی شاعری کی واحد یادگار ہے۔ اس کو ''فردوسی ہند'' بھی کہا جاتا ہے۔آذری کے ''بہمن نامہ'' کے چیدہ چیدہ اشعار ملتے ہیں۔آذری نے بھی عصامی کی تقلید میں بہمنی سلاطین کی تاریخ نظم کی۔ان کے علاوہ محمود گاواں بھی بہمنی دور کا معروف شاعر تھا ۔یہ ہر لحاظ سے بہمنی دربار میں بلند مرتبہ رکھتا تھا جیسے میدان جنگ میں کامیاب سپہ سالار،علماء کی مجلس میں ایک باعمل عالم،صوفیوں کی محفل میں ایک مکمل صوفی،سیاست کے میدان میں ایک قابل قدر سیاستدان اور ایک کامیاب وزیر تھا۔محمود گاواں کے اشعار ملاحظہ ہوں:

چوں خواجہ جہان را ہرگز حرام خواری درد دل نبود و می کرد پیوستہ جان سپاری
گشت تو شہید و مغفور ای سامی بتحقیق تاریخ کشتن او چو از حلال خواری

مجموعی طور پر بہمنی دور کی فارسی شاعری کے ان نمونوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کی فارسی شاعری ''سبک ہندی '' کے بجائے ''سبک خراسانی'' کی تقلید میں موجود ہے۔ زبان کی سادگی، انداز بیان کی سلاست و لطافت ،خیالات کی بلندی،واقعات نگاری اور ادبی محاسن کی حامل ہے

عہد بہمنیہ کے فارسی زبان وادب کے سرمایہ میں مذکورہ بالا منظوم آثار کے علاوہ کچھ نثری یادگاریں بھی موجود ہیں جو محمود گاواں کے خطوط اور صوفیاء کرام کی تصانیف پر مشتمل ہیں۔نثری ادب کے یہ نمونے طرز نگارش کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔جن میں ایک جانب محمود گاواں کی عظیم الشان تحریرات ، ریاض الانشاء اور مناظر الانشاء ہیں جو عہد وسطیٰ کی فارسی انشاء پردازی کے اعلیٰ مثال ہیں۔جب کہ دوسری طرف حضرت خواجہ برہان الدین غریب،حضرت عین الدین گنج العلم،حضرت سید خواجہ بندہ نواز گیسودراز جیسے اعلیٰ مرتبت صوفیاء کرام کی نگارشات ہیں،جن کا انداز بیان بہت سادہ اور سلیس ہے،تحریر میں لطافت اور روانی پائی جاتی ہے۔یہ سادہ بیانی اس عہد کے صوفیانہ ادب کی ممتاز خصوصیات ہیں۔

ISSN: 2394-5567 **UGC No. 47011** **S. No. 15**

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر

(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: V ISSUE: III

JULY-September 2018

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi

Professor Abdul Qadir Jafery, Allahabad

Prof. Masud Anwar Alvi Kakorvi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin Kakorvi, Lucknow

Prof. Tahira Waheed Abbasi, Bhopal

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, Director Rampur Reza Library, Rampur

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, HOD Persian, DU, Delhi

Prof. Syed Mohammad Asghar, Chairman, Deptt. Of Persian, AMU

Pro. Shahid Naukhez Azmi, HOD Persian, MANUU, Hyderabad

Dr. Mohammad Aquil, HOD Persian, BHU, Varanasi

Dr. Iftikhar Ahmad, HOD Persian, Maulana Azad College, Calcutta

Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Deptt. Of Persian, Karamat Degree College, Lucknow

Co-Editor

Atifa Jamal

Research Scholar

Department of Persian

Lucknow University, Lucknow

Miss. Nazmun Nahar,
Guest Lecturer,
Dept. of Arabic,
Bhangar College,
Bhangar-743502, (WB).

Contribution of Eminent Arabic and Persian Cultural Institutions in Bengal

Abstract:

India and Iran have had close contacts in the realm of language, literature and culture. Since the 13th century Bengal has been a seat of Arabic and Persian learning and has played vital role in promoting and preserving Indo-Persian cultural heritage. The Nawabs, officials of the British Raj, the great orientalists and the Indian scholars collected Arabic and Persian manuscripts, documents, miniatures and other artifacts which are now in the treasure trove of the Asiatic Society, Indian Museum, Victoria Memorial Hall, Hazarduari Palace Library at Murshidabad and the National Library to name but a few in West Bengal. The establishment of the Calcutta Madrasah, Asiatic Society, Indian Museum, Fort William College, Hazarduari Palace, National Library and Victoria Memorial Hall in the last two centuries have contributed a great deal to Arabic and Persian studies and are reckoned as the pioneer institutions in India or in feet the repository of Indo-Persian cultural heritage in West Bengal.

Key words:

Arabic and Persian manuscripts, Indo-Persian cultural heritage, Calcutta Madrasah, Asiatic Society, Fort William College, Hazarduari Palace, National Library.

Introduction:

The Mughal Empire was founded by Emperor Babur in 1526 A.D. began to lose its strength after the death of last great Mughal emperor

Aurangzeb in 1707 A.D. Arabic and Persian languages and literatures flourished during this period to great extent. Bengal always stood at the forefront for the promotion of Arabic and Persian studies in eastern India in particular. The transfer of authority from Bengal Nawabs to the East India Company after the Battle of Plassey (1757 A.D.) opened a new chapter in the Arabic and Persian studies. The establishment of Calcutta (1) Madrasah (1781 A.D.), Asiatic Society (1784 A.D.), Fort William College (1800 A.D.) etc. and the Indian and European scholars putting their intellectual effort widened the Arabic research field as well as the Persian research field. Hundreds and thousands of Arabic and Persian manuscripts were collected; researches were made and printed versions of the master pieces were brought out. The association of orientalists and Indian scholars in gathering the hand written Arabic and Persian works, which look upon as the Indo-Persian composite culture and the National Heritage of our country as well, not only paved the way for the posterity but cared, preserved, and promoted the Arabic and Persian languages and literatures in the eastern region of India.

Eminent Arabic and Persian Cultural Institutions in preserving and cultivating the Arabic and Persian Heritage in Bengal:

THE CALCUTTA MADRASAH

Ultimately after a long struggle the Calcutta Madrasah was declared the "Aliah University" on 5th April 2008 A.D. (2) The 225 years old institution lost its traditional identity as Madrasah but a number of technical, professional and job oriented courses have been included in its curriculum to upgrade its status.

Warren Hastings founded the Calcutta Madrasah (Mohammadan College of Calcutta as named by its founder) in October 1780 A.D.; the first institution for the Arabic, Persian and Islamic studies in India with its entire expense borne by him, which was later reimbursed, the Bengal Government took it over in April 1782 A.D. It was originally situated at Baithakkhana near Sealdah in Calcutta and was shifted to its present site at Haji Muhammad Mohsin Square/ Wellesley Square in 1827 A.D. In 1837 A.D. the government abolished Persian to make room for English as official language and established Anglo-Persian Department under direct control of the principal of Calcutta Madrasah College and this school still continues.

Main objective for establishing the Calcutta Madrasah was to produce men of adequate trained in Arabic, Persian and Muslim Law (Fiqh) for appointment in various lower posts in the administration,

particularly as interpreter of Muslim law, with a view to qualify the sons of Muhammadan gentlemen for responsible and lucrative offices and to train offices for running the revenue administration and judiciary. Its first head preceptor (Modarris i- Awwat) was Mulla Majduddin, an erudite in Islamic learning; Muhammad Ismail replaced him in 1791 A.D.

The first direct bureaucratic intervention in the Madrasah's affairs came in 1790 A.D. when the collector of Twenty Four Parganas took the charge of the Madrasah amidst widespread allegations of mismanagement and indiscipline of students. After investigation, the head teacher, Majduddin was removed in 1791 A.D. and the management of the institution was handed over to a three-member committee with the Chairman of the Board of Revenue heading it to gear up the administration of the Madrasah, Capt Ayron, a retired British army officer was appointed in 1819 A.D. as the first secretary of the Madrasah management committee, which became defunct in 1842 A.D. To rescue the Madrasah from a current of continuing deterioration a European, Dr. Aloys Sprenger, was appointed Principal for the first time in 1850 A.D. Few other European Principals followed him, the last in the series being A.H. Harley, who held office during 1910-1911 A.D. (3)

It would not be unfair to say that Arabic and Persian poets and scholars produced during 19th & 20th centuries were either the students of Calcutta Madrasah, the custodian of Islamic culture in Bengal or associated with it as a teacher. It is interesting to know that most of the scholars and students associated with the Calcutta Madrasah were also members of the Asiatic Society, which acted as the fountain institution of Arabic and Persian studies in the city. A host of Arabic and Persian scholars and poets assembled here to teach the Arabic and Persian classics. Considerable number of classical texts likes Chahar Durvesh, Ayari Danish, Tutunamah, Gulistan o Bustan i Sa'di, etc. were translated into Urdu. The important scholars who contributed to the development of Arabic, Persian and Urdu were Mir Amman Dehlavi, Sher Ali Afsus, Haider Bakhsh Haidari, Kazim Ali Jawan, Maulavi Ikram Ali, Mir Bakhshish Ali to name but a few deserve special mention.

Apart from the European scholars, there was large number of Indian scholars whose contribution for the development of the Arabic, Persian and Islamic Studies are inevitable. A host of poets who were attached to the institution, mention may be made of Mullah Muinuddin, Maulana Muhammad Wahjih, Maulavi Ishaque Burdwani, Maulana Wilayat Husain, Maulavi Hidayat Husain, Allama Abdur Rahman Kashghari, Maulana Zafar Ahmad Uthmani, etc. (4)

There is a printed catalogue of Arabic and Persian manuscripts one in the collection of the Calcutta Madrasah College (present "Aliah University"). The catalogue was prepared by Maulavi Abul Makaram Fazlul Wahab under the supervision of Maulavi Hedayat Hussain. Bengal Government Press published it in 1928 A.D. It is said that during the partition (1947 A.D.) the entire collection of manuscripts along with other documents and books shifted to present Dhaka University. There are more than 200 Persian manuscripts on various subjects. The collection included Akbamamah, Tarikh i Alamgiri, Twarikh i Kashmir, Khamsa i Nizami, Gulistan, Bustan, Nal Daman, Kulliyat i Mir Dard, Kulliyat i Khaqani to name a few. (5)

THE ASIATIC SOCIETY

On 15th January 1784 A.D. a group of British scholars and enthusiasts in Calcutta founded the Asiatic Society of Bengal, the premier Orientalist institution of its time with the object of prosecuting an "enquiry into the History and antiquities, arts, science and literature of Asia" (6) The idea of founding an association for pursuing systematic research on Asia in general and South Asia in particular first came from Sir William Jones (1746-1794 A.D.) who joined the Calcutta Supreme Court as a Judge in 1783 A.D. Already a group of Company servants including Halhed, Nathaniel Brassey (1751-1830 A.D.), Sir Charles Wilkins (1749/50-1836 A.D.), H.T. Colebrooke was quite actively involved in oriental studies. Warren Hastings (1732-1818 A.D.), the Governor General, himself was deeply interested in Indian classical languages and literatures.

On 15th January 1784 A.D. thirty Europeans gathered in the Grand Jury Room of the Supreme Court at Calcutta and adopted the proposal of Jones for establishing the institution, which was named as "The Asiatick Society". William Jones had the honour to become its first President and continued in this position until his death. Warren Hastings became the first Governor General of British India. Hastings strongly supported collecting knowledge of Indians and their customs, laws, and languages. He became proficient in Bengali, Urdu, and Persian and encouraged a generation of Orientalists in their research. Thus, he served as the Patron of the Society. Since then the position of the Patron was held by the Governor General and lately by the Bengal Governor till 1947 A.D. George Hillarow Barlow (1762-1847 A.D.) was elected the first Secretary of the Society. A large numbers of Europeans having interest in cultivating and promoting knowledge could seek membership of the Society. The membership of the Asiatic Society was thrown open to

learned natives in 1829 A.D. when five of them i.e. Prasanna Kumar Thakur, Dwarkanath Tagore, Shibchandra Das, Rasamoy Datta and Ram Kamal Sen were elected members. Now it was open for all nationalities irrespective of religion, race and caste to apply for its membership.

The Asiatic Society consisted of British administrative officials who devoted their free time for studying India. Virtually none stood to receive monetary gains from their work, and most met the research expenses out of their own pockets. Rama Sundari Mantena notes that throughout the annals of the Madras Public Proceedings, "there are numerous entries of British officials requesting compensation for expenses incurred in their research endeavours." (7) The adjective 'Asiatick' was means definitive then that of 'Oriental'. The antique 'K' in Asiatick was dropped in 1825 A.D. The geographical denomination of Bengal was introduced by James Princep in 1832 A.D. and continued till 1934 A.D. In 1935 A.D. 'Royal' was prefixed to the title (with the permission of his Imperial Majesty in 1936 A.D.). The epithet 'Royal' being a chronic in independent India (since 1947 A.D.), the society resumed its paternal name "The Asiatic Society" (without antique 'K') from 1st July 1951 A.D. (8)

From 1832 A.D. the Journal of the Asiatic Society of Bengal began to be published under the editorship of James Prinsep (1799-1840 A.D.) as a private concern, though it mainly published the research reports of the Asiatic Society. An attempt was made in 1899 A.D. to change the name of the Society to "Asiatic Society of Bengal" but the proposal was voted down by the general assembly. A Royal charter was obtained in 1936 A.D. and the Society was then renamed "The Royal Asiatic Society of Bengal." At a general meeting held on 2nd January 1950 A.D. the organisation was again named "Asiatic Society." Confusion exists about the title of the Society's journal as well. Its unofficial organ Asiatick Researches continued from 1788 to 1849 A.D. The Journal of the Asiatic Society of Bengal continued from 1832 to 1934 A.D. From 1935 to 1952 A.D. it was called the Journal of the Royal Asiatic Society of Bengal. From 1953 A.D. the Journal came to be known as the Journal of the Asiatic Society(9). The Asiatic Society of Calcutta fostered the Asiatic Societies in Great Britain, France, Germany and other countries in turn. These societies have been the most zealous promoters of Persian language and studies. Europeans who mastered Persian in Calcutta are the founders of these flourishing institutions specializing in the study of Iranian language and culture all over the world(10).

When the East India Company established its college at Hertherd in 1806 A.D. Persian was made the compulsory subject on its syllabus for probationers in the Company's service; the college of Fort William also prescribed Persian for its student Chairs of the Persian were instituted at both. Public disputation was part of the graduating ceremony at Calcutta. Finally, Asiatic Society was springing up all over the civilized world. In 1829 A.D. was established the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland with its chapter at Bombay, called Bombay Royal Asiatic Society. Asiatic Societies were also established in Sri Lanka, Malaysia, Tokyo, and America (with a different name Oriental Academy), and lately in Pakistan (today's Asiatic Society of Bangladesh). These institutions acted as the further stimulus to Persian studies in the empire's capitals and provided funds for the printing of numerous learned researches into Persian studies(11).

The Asiatic Society, presently located at 1, Park Street, Calcutta, has played very important and most crucial role in the promotion of Arabic and Persian studies in India in general and Calcutta in particular. The Asiatic Society has reconstructed and preserved the Indo-Persian cultural heritage through its edition, translation and publication of Persian manuscripts. The great scholars and Orientalists like William Jones, Charles Wilkins, H.T. Colebrook, Francis Gladwin, B.H. Hudson, H.H. Wilson, James Prinsep, Hairy Ferdinand Blochmann, Alexander Cunningham, Henry Beveridge, Edward Denison have contributed their intellectual inputs to the Society in the promotion of the Persian studies, which gave them a forum for their investigation through its publication facilities and Journals, Asiatick Researches, Gleanings in Science, Journal of the Asiatic Society of Bengal and various Memoirs.

FORT WILLIAM

Fort William College or College of Fort William is an academic centre for Oriental studies established by Lord Wellesley then Governor General of British India in 1800 A.D. within the Fort William complex. Its purpose was to impart language training to the writers recruited by the Company for civil service in their establishment in south and South-east Asia(12). Wellesley felt that both academic and moral training were necessary to make the young civilian capable of facing the challenge of colonial administration. These new civilians were posted to the various districts of Bengal. Fort William College aimed at training British officials in India languages and in the process it fostered the development of languages such as Bengali and Hindi(13).

It is considered by many historians to be starting point of the Bengal Renaissance(14). The establishment of The Calcutta Madrasah in 1780 A.D. the Asiatic Society in 1784 A.D. and the Fort William College in 1800 A.D. completed the first phase of Kolkata's emergence as an intellectual centre(15). A Department was established for each major language and culture of India. The Professors, Munshis and Assistant teachers were appointed for each Department. Incentives were given to the writers, besides assistance of Munshis and Professors. Its expenses were designed to have been met by a contribution from all the civilians in India and an uncertain allocation that was to come from the operation of the Government Printing Press. The director's simultaneously ordered Fort William College, which had proven quite expensive, reduced in size and cost, with most of its language training shifted to Britain. In 1830 A.D. Fort William College was largely closed except for use as an examination centre(16). The Court informed Wellesley that an institute like the College of Fort William would be soon established in England. Thus, it followed the establishment of the East India College, commonly known as Haileybury College (located at Haileybury) in 1805 A.D.

The Persian establishment attached to the College of Fort William from 1800 to 1830 A.D. was the biggest as compared to any other language. P. T. Nair informs: "Persian was continued to enjoy as the court language of India, had a Department headed by Neile B. Edmonstone, then a Persian translator to the Government his Assistant teacher was John H. Harington, a Judge of Sadar Diwani Adalat and Francis Gladwin, a soldier diplomat. Francis Gladwin, William Kirkpatrick, John Harington and others were Professors in Persian in 1801-1809 A.D. Mathew Lumsden who started as a Teacher of Persian in 1801 A.D. became Professor of that language in the College in 1807 A.D. and continued in that office for 16 years. James Atkinson (1816-1818 A.D.), Samuel Coulthard, J.W.J. Ouseley and John Weston were also in the faculty of Arabic and Persian during 1800-1830 A.D.(17)"

For Arabic studies, Wellesley engaged Lt John Baillie, who was considered to be the best Arabist after William Jones. The Hindustani Language Department was entrusted to John B Gilchrist, an Indologist of great repute. H.T. Colebrook, the famous orientalist, was selected to head the Sanskrit Department William Cary, a non-civilian missionary and a specialist in many Indian languages including Bengali, was selected to head the Department of Vernacular Languages. All the Departments had a number of Pundits and Munshis who made up the native element of the College staff. Among the most celebrated Bengali staff members of the College were Ramram Basu, Tarinicharan Mitra and Mrittunjoy

Bidyalankar, Madan Mohan Tarkalankar (1817-1858 A.D.)(18). With the help of these Pundits the Professors of the College successfully experimented with standardizing Bengali language and fashioning its prose (19).

College of Fort William had good number of native Munshis in Persian. Civilian trainees were given Munshis for learning Persian from them directly. Professors always paid personal attention to their trainee. The Munshis who served in the Fort William College some of them were Abdul Khud (1813 A.D.), Abdul Rahman (1812 A.D.), Allah Dad (1801 A.D.), Asadullah (1801 A.D.), Badar Ali (1801 A.D.), Ganga Bishan (1801 A.D.), Gholam Ahmad (1805 A.D.), Gholam Bhik (1801 A.D.) etc. At least ten Persian Munshis were appointed in 1801 A.D. Mir Abdur was sent from Fort William College to Haileybury College in 1807 A.D. to teach Persian when the East India Company opened that administrative training establishment Maulvi Mir Abdul Ali of Varanasi, had already worked at Fort William College as a Munshis in the Persian Department since about 1801 A.D. but he was qualified to teach Hindustani as well (20). Maulvi Mirza Khalil of Lucknow was qualified to teach those two languages as well as Arabic. These two men came separately to England in 1807 A.D. and 1808 A.D. respectively, each attended by a Muslim personal servant(21).

The Fort William also encouraged translations of Classics in Arabic, Persian and Sanskrit into English and Indian languages and compilation of bilingual or multilingual lexicons. Availability of the press greatly facilitated the publication programme of the College, which in the works of Gilchrist had become "an asylum for Oriental literature.(22)"

The Arabic and Persian works issued by Fort William College some of them are:

- Persian Guide, 1802 A.D. Francis Gladwin- Elementary Grammar for the students at the College.
- Persian Munshis, 1802 A.D. Francis Gladwin, Elementary Persian Syntax and Arabic Grammar.
- A Grammar of the Persian Language, 1810 A.D. by M. Lumsden.
- Hidaya I & H, 1807 A.D. HI & IV, 1808. Translated from Arabic: A Compendium of Islamic Law, edited by Maulavi Muhammad Rashid.
- Mujmooue Shumsee, 1807 A.D. Translated from Arabic. A concise view of the Copemican system of Astronomy. Maulvi Abul Khair under the superintendence of W. Hunter.

- Sirajeeyu, 1811 A.D. translated from Arabic. Law of succession and inheritance, translated by Mufti Muhammad Rashid etc.

HAZARDUARI PALACE LIBRARY (MURSHIDABAD)

Murshid Quli Khan (d. 1727 A.D.), the first of the Nawabs, came to Murshidabad (name after him) in 1700 A.D. as Subedar and the founder of an independent provincial dynasty (23). He became the Subedar of Bengal in 1717 A.D.; he reigned over Bengal, Bihar and Orissa from his capital Murshidabad with only a nominal allegiance to the Mughal Emperor. He opened a mint and introduced the "Zurb i Murshidabad" (24) coin. Murshid Quli Khan had built the magnificent Katra Masjid (mosque) in 1723 A.D. He lies buried under the stairs leading up to the terrace of the mosque, as marks of humility (25). Murshidabad has played an important role in the promotion of Persian studies. Persian being the official language of India enjoyed the patronage of the Kings and Nawabs of the time. A large number sufis, poets and writers adorned the courts of Bengal Subedars. The East India Company reigned from here for many years after the Battle of Plassey.

The Hazarduari Palace, (the palace with a thousand doors) also known as "Barra Kothee" is a large and imposing pile of building in the Italian style at Murshidabad was designed by Duncan McLeod for the Nawab Nazim Humaun Jah, descendent of Mir Ja'far in 1837 A.D. This three-story palace was once used to hold Durbar and later became the residence of the high-ranking British Officials. The stone slabs imbedded in the walls of the pedestals from triple lamp posts, one bearing an inscription in Persian and the other in English.

It is now a museum and its library has huge collection of Arabic, Persian and Urdu manuscripts, and documents. The gallery has beautiful collection on armoury, splendid paintings, and exhaustive portraits of the Nawabs, various works of art including beautiful works of ivory of China (European) and many other valuable artefacts on display for the visitors. The library contains very huge and varied collection of books and most rare and valuable oriental manuscripts. Graphical embellishments of various kinds, brilliantly coloured into, gold, enamel, highly finished ornamental and floral designs, of every conceivable fanciful and elegant description, make the Holy Qur'an and other manuscripts gorgeous and artistically beautiful. Some are mere perfection of the calligrapher's art. The collection of Holy Qur'an is unique in India. The total number of Arabic and Persian manuscripts in the collection of Hazarduari Library is considerable.

THE NATIONAL LIBRARY

The Imperial Library was formed in 1891 A.D. by combining a number of Secretariat libraries. This was opened to the public on 30th June 1903 A.D. at Metcalf Hall, Calcutta, renamed in 1947 A.D. as the National Library. John Macfarlane, the Asst. Librarian of the British Museum, London, was appointed as the first Librarian of the Imperial Library (26). It contains the consider number of Arabic and Persian manuscripts donated by Maulavi Sayyed Sadruddin al-Musavi, a landlord of Buhar, Burdwan, West Bengal and Sir Jadunath Sarkar, a well-known historian of the medieval India.

Conclusion:

In the 13th century, Bengal came in contact with Arabic and Persian, the two languages of the Islamic world. Arabic was used as the language of religion in the region while Persian became the vehicle of cultural expression in Bengal. The Hindus and Muslims both had accepted the role of Persian language as a vehicle of cultural expression in the 18th and 19th century. Islamic cultures which eventually became the dominant culture in Bengal gave birth to a new society known as Persianate Society in Bengal. There are numerous calligraphic and lavishly illuminated, gilded and illustrated texts and some of the copies of manuscripts which are unique and rare in Bengal. They are fruitful for studying cultural interactions of Persianate society with Bengal in the past and in present times they reject the views of "clash of civilizations". Besides above mentioned institutions there are a small but good number of Arabic, Persian and Urdu manuscripts preserved in the Indian Museum, Iran Society, Maulana Azad College, Visva-Bharati University etc. to name but a few.

References

[1] In 1596, it is mentioned in the Ain l Akbari as a rent-paying village named 'Kalikatta' under Sarkar Satgaon. (see Ain l Akbari p. 141, Vol. 2. Jr. tr.).
[2] The Telegraph, Kolkata, April 6,2008
[3]Moniruzzaman MA 'Calcutta Madrasah', Dawn, Calcutta Madrasah College Post Bi-Centenary Silver
Jubilee Celebration, February 17-19, 2006, pp.38-39
[4]Sarwar, Gholam, Persian in Bengal (1203- 197), Indo-Iranica, vol. 59, 2006, (3-4), p. 11
[5]Fazlul Wahab, Maulavi Abul Makaram. Catalogue of Arabic, Persian and Hindi manuscripts in the Madarsah Alia, Bengal Government Press, 1928
[6]Aurtber. J. Arberry, British Contributions to Persian Studies, Longsmans, 1942, p. 15 b
[7] Rama Sundari Mantena, "Vernacular Futures: Orientalism, History, and Language in Colonial South
India," (Ph.D. diss., University of Michigan 2002), p. 21.

[8] Proceedings of The Asiatic Society vol. 1,1784-1800, comp. & ed. Sibadas Chaudhuri, Calcutta, 1980, p. 59
[9] Proceedings of The Asiatic Society vol. 1,1784-1800, comp. & ed. Sibadas Chaudhuri, Calcutta, 1980
[10] Nair, P.T. Calcutta's Contribution to Persian Studies,, Indo-Iranica, vol. 55, (1-4), 2002, p.20-21
[11] Aurther. J. Arberry, British Contributions to Persian Studies, Longsmans, 1942, p. 15 B
12 Nair, P.T. Calcutta's Contribution to Persian Studies, Indo-Iranica, vol. 55, no. 1-4, p. 23
13 Sarkar, Nikhil, Printing and the Spirit of Calcutta, in Calcutta, the Living City, Vol. I, edited by Sukanta Chaudhuri, pp. 130-2, Oxford University Press, ISBN 0195636961.
[14] Sengupta, Nitish, 2001-02, History of the Bengali-speaking People, p. 212, UBS Publishers' Distributors Pvt. Ltd., ISBN 8174763554.
[15] Majumdar, Swapan, Literature and Literary Life in Old Calcutta, in Calcutta, the Living City, Vol. I, edited by Sukanta Chaudhuri, pp. 107-9, Oxford University Press, ISBN 0195636961.
16 Michael H. Fisher, Persian Professor in Britain: Mirza Muhammad Ibrahim at the East India Company's College, 1826-44, Comparative Studies of South Asia, Africa and the Middle East, vol. XXI. Nos. 1 & 2 (2001) p.25
17 Nair, P.T. Calcutta's Contribution to Persian Studies, Indo-Iranica, vol. 55, no. 1-4, p. 24
18 Madan Mohan Tarkalankar (1817-58) taught at Fort William College. He was one of the pioneers of text book writing. Sengupta, Subodh Chandra and Bose, Anjali (editors), 1976/1998, Sansad Bangali Charitabhidhan (Biographical dictionary) Vol I, p. 391., ISBN 8185626650 (Bengali).
19Sirajul Islam, Bangalapedea.
20 Michael H. Fisher, Persian Professor in Britain: Mirza Muhammad Ibrahim at the East India Company's College, 1826-44, Comparative Studies of South Asia, Africa and the Middle East, vol. XXI. Nos. 1 & 2 (2001) p.26, Public Letter from Bengal 8 February 1808, F/4/259/5665, BL.
21 Michael H. Fisher, Persian Professor in Britain: Mirza Muhammad Ibrahim at the East India Company's College, 1826-44, Comparative Studies of South Asia, Africa and the Middle East, vol. XXI. Nos. 1& 2 (2001) p.26,; Extract Letters from Bengal 14[24] July 1807, 25 September 1807; Letter to Bengal 19 July 1826. May 1806, J/l/35, BL. 7 November 1857.
22 Perti, R.K. (ed) Catalogue of Manuscripts of Fort William College Collection in the National Archives of India library, New Delhi, 1989, p. ii
23 Sarkar, Sir Jadunath. The History of Bengal, vol. II, 1948, p.397.
24 Majumdar, Puma Ch. The Musnud of Murshidabad (1704-1904), Murshidabad, 1905. p 21
25 Ibid, p 172
26 http://www.nationalHbrary.gov.in/nat_lib_stat/history.html

Bibliography:

1) Abid Husain, S., The National Culture of India, NBT, India, 2003.
2) Abdur Rahim, M, Social and Cultural History of Bengal, vol I, Karachi, 1963.
3) Abu'l Fazl 'Allami, Akbar-nama, trans. Beveridge, Vol. HI, 1993.
4) Arberry, A.J., British Contributions to Persian Studies, Longsmans, 1942
5) Browne E.G., A Literary History of Persia, vols I-IV, Cambridge, 1951.
6) Said Amir Aijomand, Studies on Persianate Societies, (2004).
7) Victoria Memorial Hall, Correspondence -1901-1904.

Dr. Razina Khatun
Ph.D. Department of Persian, Arabic, Urdu & Islamic Studies
Visva Bharti, Shantiniketan, W.B.

PERSIAN LITERATURE AND ITS AFFECTION TO NON-MUSLIMS DURING MUGHAL PERIOD

India has ever been a land of interest to foreigners. Many invaders travelers and expeditioners came here with certain motives. They brought along with themselves their cultural heritage lingual and philosophical riches but over a period of time they got assimilated in the vast ocean of Indian culture and social ethos.

Like many invaders the Turks also came here in search of fortune. The Sultanat period brought India very close to West-Asian nations. The Mughals not only won India but also enriched Indian art, culture, architecture, literature, music, good governance and a hoard of human intellectual pursuits were brought along given royal patronage and given impetus to flourish and get accomplishment. The Mughal period is an era of human accomplishment.

With the coming of the Mughals, a new era in Persian literature started. The Persian Literature flourished during Mughal period and it was period of growth literature in India. The Indian literature witnessed the Golden age during the Mughal Rule.

Since the Timurids rule was confined to Persia, but the descendants of Timur ruled over India under the title of Mughal Empire for three centuries. The Mughal Empire that had been established in India by Zaheeruddin Babar, defeating Ibrahim Lodi in the battle of Panipath in 1526 A.D. After the establishment of the Mughal in India, hosts of poets and writers left Persia and folked to the court of the Mughal Emperars. Almost all the emperor (Babar, Akbar, Jahangir, Shahjahan, Aurangzeb) were great patrons of learning and entertaining the men of letters and scholars at their courts. The munificence and benevolence in respect of poets and scholars made India another Persia.

The founder of the Mughal Empire Babar brought with him poets and scholars like Abul Wahid Farighi, Nadir Samarqandi and Tahir Khawandi from central Asia. Though Babar himself wrote in Turkish, his court provided forum to both persian and Turkish writers. Babar himself was a poet and great historian. According to T. Lanepool, “In Persian, the

language of culture-the Latin of central Asia-he was an accomplished poet; and his native Turkey, he was master of a pure and unaffected style alike in prose and verse." Babar was a great patron, for example he wrote in his memoirs about Jami "The all surpassing head of the poet band was Maulana Abdur Rahman Jami. He was unrivalled in his day for esoteric and exoteric knowledge. Famous indeed are his poems, The Mulla's dignity it is out of my power to describe : It has occurred to me merely to mention his name and one atom of his excellence as a benediction and good omen for this part of my humble book." 1[a]

Suleiman Shah, a cousin of Babar, also wrote verses both in Turkish and Persian. The other prominent literary figures of Babar's time were Shaikh Zainuddin, Mulla Shihab and Khwandamir. Gulbadan Begam, the daughter of Babar was also a great scholar and she wrote Humayun Nama on the specific request of Akbar. Shaikh Zainuddin who was the secretary of Babar, was an accomplished scholar of Turki, Arabic and Persian.

According to Badauni, "He was one of the greatest scholars of the age and was the first to translate into Persian the Turki memoires of Babar. He also commented on Mabayyan, a work which Babar had written on Hanafi Jurisprudence. He was known as Zainuddin Khawafi, although he wrote as 'Wafai'. The important work which he wrote covers the whole history of the conquest of India by Babar." M.A. Ghani said- "Among Babar's contemporaries there were many who came to India, and wrote their works here under the Indian patronage. No parallel instance is to be found in history of a period prior to his in which poets and scholars of Persian language migrated to India in such large numbers. It is mostly from his regime or the advent of the Mughal rule that the Persian language in India has acquired its own significance."

Humayun, the son of Babar was also a great patron of poetry as well as prose. Like Babar he was also adept at writing poetry and wrote Masnavi, rubai, diwan as well as ghazal. According to Ghani, "From his own verses which include almost all principal kinds of poetry except qasida and qita, his position as a poet of the Persian language is clearly established.In his 'rubai' and 'ghazal' while behind no one, he stands ahead of many of his contemporaries. The chief feature of his style is the clearness of expression which pervades all his writings, and his words are always few, simple and compact." 1[b]

Humayun encouraged other scholars, poets and historians. A large number of them adorned his court. Shaikh Amanullah Panipati wrote qasida, Shaikh Abdul Wahid Bilgrami and Shaikh Gadai were two

prominent Hindi-Persian Poet at the court of Humayun Mohammad Ibn-i-Ashraf al Hussaini or Dustamdari wrote Jawahir nama-i-Humayuni in 22 Chapters.

Another important work of history produced during his time was 'Nafais ul Maasir by Mir Alauddaula Kazwini. Maulana Qasim Kahi compiled a diwan in which he included a number of qasida, masnavi, and ghazal. Shah Tahir Dakhani also wrote qasida and masnavi in praise of Humayun. Another prominent literary figure of Humayun's time was yusuf bin-i-Muhammad Hirwal who is credited with important works like Riyar ul Insha, Jamiul Faicaid Qasida Fihifz-i-Sihat, Badaiul Insha. Badaiul Insha, it dealt with the art of literary composition. Jauhar wrote Tazkirat-ul waqiat. Khawaja Hussain Mervi apart from compilling a diwan also translated the famous Hindi work Singhasan Battisi into persian.

The Persian literature made a wonderful progress during the times of Akbar. A number of outstanding works of literary and historical importance were produced during his time. Some of the prominent works of his time include Tarikh-i-Alfi of Mollah Daud, the Ain-i-Akbari and Akhamama by Abul Fazal, the Muntakhab-ut-Twarikh the Tabakat-i-Akbari of Nizamuddin Ahmed, Masir-i-Rahimi of Abdul Baqi.

Abul Fazal apart from being a great scholar was a personal friend and counselor of Akbar for almost 35 years. The quantum and quality of his work has been greatly admired by the scholars. For example, V.A. Smith says, "Abul Fazal alone among the historians aimed at producing a work worthy to be ranked as literature, but can hardly be said to have succeeded." 1[c]

Abul Qadir Badauni wrote Muntakhab-ul-Tawarikh which is also known as Tarikh-i-Badauni, a general history from the times of Ghaznavids to the fortieth year of Akbar. This work is specially useful in correcting fulsome eulogium of the Akbarnama. It also helps informing correct impression of the character of the great Mughal ruler.

The Persian literature produced in India abounds in Masnavis, Diwans, Kulliyats, Biographics, Histories, Commentaries, Laxicons, Metaphyoics, Medicine, Logic, Philosophy and from amongst a host of literary men who flourished in India, such as Amir Khusraw, Abul Faiz Faizi and Jamaluddin Urfi.

Amir Khusraw:

Every brunch of Persian literature was presented in India, with a remarkable proclivity for new experiments and innovations in new literary genres producing original contributions, both in content and form. The profusion of traditions and beliefs in India provided a fertile ground for poets and writers who used the protentials of Persian and its range and malleability to the full in exploiting these initially discordant features. The Persian work of one of the first masters, Amir Khusraw born of Patiyali (1253-1325) in the district of Etah in Uttar Pradesh, covers almost all the literary genres with a stamp of ingenuity and

originality with few equals in all Persian literature. According to Shibli Nomani, Khusraw, like Saadi had brought his language closer to the colloquial thus making his poetry all the more sweet and appealing. The chief characteristics of his ghazals are purity and simple fluency, delicacy and fire, tenderness and elegance, love and life, softness and refinement, music and melody. The following lyrical verses may be cited in its example.

"Man tu shudam tu man shudi, man tan shudam tu jaan shudi

Ta kas na guyad baad azin , man diagram tu digari" [2]

i.e., "I became you(I lost in your heart soul) you became me, I became body you became soul, For people not to say that we are apart from now on."

Dr. M. Waheed Mirza, an authority on Khusraw stated : "There have been in the history of the world but few instances of a scholar or a poet acquiring a popularity and a fame like those of Khusraw centuries have elapsed since the 'Parrot of India' sang his last song and the voice that had charmed princes and peasants was hushed for ever, yet the memory of his name is as fresh today as ever." [3]

Abul Faiz Faizi :

Among the Indian poets who have been accorded recognition equally by Iranian and Indian crities and memoir-writers, the name of Abul Faiz Faizi is the most prominent. Actually speaking the Personality of Faizi, next only to Amir Khusraw tops the list of the Indo-Persian poets. In the words of Shibli Nomani, Persian poetry in its long chequered career of six hundred years in the Subcontinent has produced only two poets of outstanding merit – Amir Khusraw and Abul Faiz Faizi.

Shaikh Abul Faiz Ibn Mubarak, popularly known by his pen-name, Faizi (20th September- 1547-15th October-1595) was a poet and scholar of late medieval India. In 1588, he became the Malik-us-Shaura (Poet Laureat) of Akbar's Court. Akbar highly recognized the genius in him and appointed him tutor for his sons and gave place to him among his decorative 'Navaratnas'.

Faizi's style is chaste, pure, and free from all kinds of vulgarism, and in all his works we find the noblest sentiments expressed in a most beautiful language. "Faizi is known as the king of poets. Badauni also says, "He excelled in the arts of Versification, enigmatic lines and rhyming. In history, in Philology, in medicine, in letter writing, and in composition, he was without a rival."

Faizi is also remarkable for introducing historical events in the ghazal and thus widened its scope. The ghazal which he composed on the occasion of Akbar's reception at Fatehpur after the conquest of Gujrat in 1572 A.D. is –

"Nasim khushdil az Fatehpur miayad,

Keh Badshah-e man az rahe dur miayad" [4]

i.e., " The soothing blow of Zyphire comes from Fatepur.

That my Lord the king comes from a long distance."

Badauni and few others have credited Faizi as the author of 101 works of which very few have come down to us. Abul Fazal has furnished us the names of few works only. Faizi had planned to write Khamsha but he was not fortunate enough to complete it. Khamsa was to be written as follows.

1) Markaz-e-Adwar 2) Soleiman wa Billquis. 3) Nal-O- Daman.
His Diwan (collection of Poems), was entitled Tabashir-al-Subh. It comprises qasidas, ghazals, rubais and elegies. And – Latifa-i-fayyazi, Lilawati, Mawaridul Kalam and Sawatiul-Ilaham are the prose works of Faizi.

Urfi Shirazi:

Urfi was born at Shiraz and this is acknowledged by all the memoir writers and historians. (The exact date of his birth is not known, he died in 15920 A.D.).

When Urfi came to India in 1585 A.D. he reached Fatepur Sikri, where he was welcomed by Faizi, the poet laureate of Akbar. Faizi received him cordially and treated him with all possible kindness and favour. For some time Urfi lived under his patronage, but he could not stay these for a long time and soon after was attached to Hakim Abul Fath Gilani. Urfi soon excelled all the prominent poets living of Gilani's court. After the death of Gilani, he joined the court of Khan Khanan who rewarded him lavishly and later on introduced him to Emperor Akbar. But unfortunately after two years of his joining the court of Akbar he died in 1592 (999 A.H). He buried at Lahore.

It seems that all his poems composed in the beginning of his career were lost along with his Diwan. He complied another Diwan consisting of 8000 couplets, 26 Qasidas, 270 ghazals and 700 Couplets of Qitas, Rubais and Musammats.

He wrote Majmaul Akbar consisting of about 1400 Couplets and Farhad wa Shirin of about 400 Couplets.

His (Urfi) prose work-Risala-i-Nafsia consisting of about ten pages. If Urfi had not died in the prime of his youth, he might have become the greatest poet in the Persian literature.

Urfi though born and brought up in Iran, he is more appreciated in India. "His poetry is saturated with the courage of his convictions, independence of Spirit and love of freedom and high ideals- qualities which are not often seen in the Persian Poets in general."

"Kasideh kar-e hawas pishegan bood Urfi

Tu az kabileh Ishqi wazifehat azal ast" [5]

i.e., "Writing Qasida was the profession of greedy people, O Urfi,

You belong to the group of these pursuing love and so it is your

obligation to write ghazal."

Akbar had set up a special department for translation with a view to bring about fusion in Hindu and Muslim cultures and to provide a common literature to the people of this country. A lot of notable works of Sanskrit, Arabic, Turkish and Greek were translated into Persian. Thus Abul Fazal Joshi, lated many Sanskrit works like Kisan Joshi, the Gangadhar, the Mahesh Mahananda into Persian.

Malialharat was translated into Persian by Naqib Khan. Ramayana was translated into Persian by Abul Qadir Badauni and Shaikh Sultan of Thaneshwar. Atharvaveda was translated into Persian by Haji Ibrahim Sanhindi. Lilawati, a Sanskrit treatise on mathematics was translated into Persian by Faizi. Rajtarangini, a famous historical work written in Sanskrit about the history of Kashmir was translated by Maulana Sheri, while Abul Fazal translated Panch Tantra.

In short, we can say that Akbar made valuable contribution in the direction of providing a common culture to the people of India.

The next Mughal ruler Jahangir, the son of Akbar, was not only an intellectual like his father but he had a taste for literature. He accorded patronage to men of learning and his court was adorned with many literary figures such as Nasiri of Nishapur, Ghiyas Beg, Naqib Khan, Niyamat-Ullah and Abdul Haq Dehlvi.

He wrote his own abtobiography entitled Tuzuk-i-Jahangiri in which herevealed his daily life with freshness and candor. Another

historical work produced during his time was Iqbal-namah-i-Jahangiri by Myamid Khan, which is considered to be a primary source for the history of his reign. The other important historical works produced curing his time were Maasir-i-Jahangiri and Zubd-ut-Tawarikh.

His reign also witnessed the production of outstanding poetry as well as commentaries on Quran. One thing which strikes most that the Department of Translation which had been very busy under Akbar seems to have been disbanded by Jahangir.

Shah Jahan, the next ruler also continued to patronize men of learning. Banarsi Prasad Saksena observed that the Persian literature produced during his period was not purely Persian. He says, "The Persian language had come to stay in India, and it could not for long keep itself aloof from its new and powerful environments. It observed Indian ideas and Indian thoughts, and it was used for Indian subjects. Necessarily, it developed a distinct character."

The prominent scholars who were patronized by Shahjahan were Abu Zalih, Haji Mohammad Jan, Chandra Bhan Brahman, Abdul Hamid Lahauri, Qazwini, Inayat Khan. Abul Hamid Lahauri was the court historian of Shah Jahan and wrote Padshah-Nama. During his time a large number of scholars came from Persia.

Dara Shikwah, one of the Princes of Shah Jahan, who was also a great Patron of learning. A number of scholarly works were produced under his patronage. He not only got the Hindi scriptures like Gita, Upanishads and Yoga Vashistha translated into Persian but also wrote a treaties on the technical terms of Hindu Pantheism.

The most outstanding work of Dara Shikwa was Majm-ul-Bahrain (Mingling of the Oceans) in which he tried to show how Hinduism and Islam were two paths leading to the same goal.

Aurangzeb, was a critical scholar of Islamic theology and Jurisprudence. A number of histories were written about his time but they were not the outcome of his patronage. These works were produced by the scholars independently. Thus Khafi Khan wrote Muntakhab ul-Lubab, Mirza Mohammad Qasim wrote Alamgir-Nama, Iswar Das Nagar wrote Maasir-i-Alamgiri, Bhim Sen wrote Nuskha-i-Dil Kasha and Sujan Rai wrote Khulasa-ut-Tawarikh.

Under the successors of Aurangzeb Persian literature continued to be patronized. It was only during the times of Mohammad Shah (1713-1748) that Persian was neglected and attention began to be paid to Urdu. However, even during the later Mughal Period a number of works both on Sufism and history were produced in Persian by both Hindu and Muslim Scholars.

Some of the important chronicles produced during the later Mughal period were Sair-ul-Mutakherin by Gholam Hussain, Tarikh-i-Muzaffari by Mohammad Ali Ansari, Tawarikh-i-Chahar-i-Gulzar-i-Shujai by Hari Charan

Das, Imad-us-Saadat by Gholam Ali Naqvi, and Haqiqat-ul-Aqalim by Murtaza Hussain Bilgrami.

In the south side of India also the Persian literature continued to flourish and some of the outstanding works in Persian were produced. In 1611 Farishta wrote the monumental work Gulshan-i-Ibrahimi which is regarded as the most compendious of Chronicles produced during Medieval India.

The Non-Muslims have played a vital role in the propagation and promotion of Persian language and literature throughout the India. They were very much affectionate and influenced by the Persian language and literature. During the Mughal period many Hindu poet's writing in Persian earned great fame such as Raja Monahar Das and Bhupat Raki (Gorekar P- 76-77). A Hindu author, Laxmi Narayan Safiq (d-1745), composed to important biographical anthologies of poets : Gole-e-rana, dealing with the poets of Indian origin writing in Persian and Sam-e-gariban, about poets of Persian origin who had settled in India.

Bengal did not lack behind it, besides their Muslim counter parts they also took interest in Persian. During the Medieval period of India Persian was the court language and with having the knowledge of this language, it was difficult to obtain any government service. The Sufi-Savants who visited many parts of India they also played vital role in the promotion of Islamic studies, Persian and the Arabic language and literature. Persian which left deep impact on Bengali literature enriched the Bengali language also. It attracted many hindu Bengalis poets towards Persian. They enriched the Persian language and literature.with their genious and intellect.

In the day of Socio-religious revivals in Bengal under the leadership of Raja Rammohan Ray, Sufi culture specially of the Sufi poets of Persia was a thing of pride among the upper class Bengali Hindus of 18^{th} to 19^{th} century. Raja Rammohan Ray published the first Persian newspaper named Mirat-ul-Akhbar from Bengal itself. When it is published during that time any news paper was not published even in Iran and Afghanistan. Like this, the Hindu Bengalis, poets helped in popularing Persian language in Bengal.

Besides the Muslims and European scholars, the Bengali Hindus also took immense interest in Persian studies and contributed immensely to the Persian literature. Girish Chandra Sen, Harinath Dey, Bharat Chandra Ray, Raja Krishnadeve, Tarani Chanran Mitra, Dwarkanath Tagore, devendranath Tagore, Gopimohan Tagore are the Bengali scholars of Persian, under the patronage of Dwarkanath Tagore some prominent Persian news papers were published such as- 'Bangadoot', 'Haft Rozah', 'Bengal Herald' from Bengal. Later Maharshi Devendranath, the father of Tagore with his remarkable knowledge of Persian literature was deeply influenced by the writings of many Iranian

poets specially of Hafiz Shirazi and it went a long way in moulding and shaping his pshychical framework. He used to listen ghazals of Hafiz regularly and continued listening to ghazals even in his death-bed.

Rabindranath also very much influenced by the Persian literature. He was first time introduced to this language from his father. If we try to watch at close, the poetic heart of Tagore and that of the Sufis, we will find it the same. Tagore says :

" Dao he ridoy vore dao,

Sudharose matoara kore dao,

Sei sudharos paane tribhuban mate taha more dao." [7]

i.e., "Fill, fill up to the brim this heart,

Make me inebricated with that

Give me the wine that intoxicates the universe"

The same delight when expressed by Hafiz comes to us as:

"Saqi benur-e badeh bar afroz jame ma

Mutrib bego ke kar-e jahan shud bekam-e ma" [8]

i.e., "O Saqi, fill up my cup with the glittering wine and make it shine

O singer sin a song my desire is fulfilled now."

So, it is not possible to give a list of all the poets, prose writers and other literary figures who enriched the Persian language during Mughal Period in India. But it is really noteworthy that the Persian learning attracted both Hindus and Muslims all over the country.

Reference:

1.[abc] Persian literature under the Mughal period. Searched at www.historydiscussion.net

2. Agarwala, R.S.- Asthetic consciousness of Tagore-(First Ed. 1996), p- 163.

3. Ahmad, Tanwir- A Short History of Persian Literature, Published by- Md. Irfan, Naaz Publishing Center, p- 190.

4. Ibid, p- 227.

5. Ibid, p- 231.

6. Tagore, Rabindranath,- Gitabitan, p- 838.

7. Agarwala, R.S.- Asthetic consciousness of Tagore-(First Ed. 1996), p- 135.

Sk Md Hafizur

Research Scholar

Dept of Arabic, Persian Urdu & Islamic Studies

Visva Bharti, Shantiniketan, W.B.

Dr. Hira Lall Chopra: An Erudite Scholar of Persian

Dr. Hira Lall Chopra was not very much familiarized in the metropolis of Calcutta but was gradually emerging as a star-attraction of literacy, social and cultural gatherings because of his superb oratory and commendable knowledge of English, Persian, Urdu, Hindi and Punjabi. He was at ease in any of the mentioned languages when addressing a meet of quality.

His mother tongue was Punjabi. He learnt other languages, and achieved proficiency in Persian to such an extent that he could speak it forcefully, impressively, without least fumbling. Equally forceful was his pen in Persian. Once when the Shahenshah Aryamehr Mohammad Reza Shah Pahlavi of Iran visited New Delhi, Dr. Chopra recited at the airport in a loud voice his specially composed verse in Persian in praise of the monarch which attracted the Shahenshah's attention and His Imperial Majesty halted for a while with a smile. The Imperial Government of Iran Decorated Dr. Chopra with a medal in recognition of his services to the cause of the Indo-Iranian relations.

Dr. Hira Lall Chopra's association with the Iran Society began from January 14, 1949. He rather impressed the architect of the Society, Dr.M. Ishaque, himself an eminent Iranologist, by his knowledge of Persian language and literature as well as the history of Persia. Seldom any big Literary Meet of the Iran Society was missed by this scholar; he was a permanent figure of merit to participate and deliberate. Right from 1949 till 1993 he was the most familiar figure in the family of the Iran Society. He bade adieu to the Society with his lecture on Iran in the Twentieth Century 1900-1992 on September 25, 1993. Never again he set his feet within the precinct of this institution due to declining health, and ultimately succumbed to death on January 21, 1994 when the members were busy making last-minute preparation for the Plenary Session of the

Golden Jubilee Celebration of the Iran Society. Thus snapped once for all the Society's 42- year long association with a versatile personality.[1]

Professor Hira Lall Chopra was a towering and dynamic personality, both literally and figuratively. He was tall, well-built, strong and a true representative of the sons of Punjab. His very presence would choose to attend. Similarly he had a high intellectual stature. He was fluent in many languages, English, Hindi, Urdu, Persian and Punjabi, and the talks he would deliver were full of profound thought sometimes interspersed with recitation of poems. He had incisive intellect and clean perception. He could always impress the members of the audience.

Professor Chopra was an ardent nationalist; often he would tell me about the taste of his youth when he worked with top national leaders of the country. He was a true follower of Lala Lajpat Rai, the Lion of the Punjab, who laid down his life after he was beaten hard by the police. Professor Chopra used to organize meetings of leaders like Sarojini Nidu in the city of Lahore. His reminiscences of thoughts and taste of national struggle had always impressed me.[2]

After the partition of the country Professor Hira Lall Chopra came to Calcutta with his family and soon started playing important roles in the social, intellectual and cultural life of the city. He was connected with the University of Calcutta where he was dear to his students. He became associated with many prominent intellectual societies in Calcutta and the Iran Society was one of them. The Professor used to attend a number of meetings of the Iran Society. He had been Vice-President of the Society. His talks with constructive suggestions always went for the furtherance of the objects and affairs of the Society.

The robust-youthful-like Chopra, then only 46, thundered extempore on the various aspects of the savant in the presence of a distinguished gathering which included Dr. Harendra Coomar Mookherjee, the erudite Governor of West Bengal; Sir Jadunath Sarkar, the doyen of Indian historians; Prof. Suniti Kumar Chatterji, the reputed philologist; and Dr. Kalidas Nag, the well-known historian. His glamour, rhetoric and razor-sharp expression took the hall-packed audience spell-bound. [3]

In 1931, he started teaching Persian and Urdu just after compiling his M.A. to graduate and post-graduate classes in the S.D. College, Lahore, and the Punjab University from 1931. As a young lecturer, he was very successful. It is said that because of extempore scholarly presentation and erudition, his lectures were attended not only by his regular students but also by non-Urdu and non-Persian students. His lectures were

extremely popular and enabled him to build-up a good rapport with his students and other listeners. In 1932, he was elected as a Member of the Punjab University Board of Studies in Arabic, Persian, Pashto and Urdu and as a non-Muslim he was the first person to be a Member of this Board which had eminent personages like Sir Mohammad Iqbal and Sir Abdul Qadir as its members. He edited and published the Diwan-i-Zauq and the Diwan-i-Hali which were prescribed as text books for the Intermediate classes from 1934 onwards.

He reached Srinagar via Jammu in early June 1947. Contrary to what was expected, matters got worse. India was partitioned into Bharat and Pakistan on the 15th August, 1947 and his native place Hafizabad, Lahore where he taught, and Multan where he had his business all was delineated in the territory of Pakistan. The biggest migration of populations of Hindus, Sikhs and Muslims, on communal basis, in the history of mankind had already commenced in the East and West Punjab. The swiftness of events had taken everyone by great surprise. He had on where to fall back upon. Because of Qabaili invasion of Kashmir supported by Pakistan, all land routes to and from Kashmir were blocked and Kashmir was practically cut off from the rest of the country. The Maharaja of Kashmir signed the instrument of accession of Kashmir to India and thereafter the Government of India sent its troops and materials by Air Force planes to Srinagar to fight the invading Qabailis and on their return flights, the aircrafts used to evacuate stranded people in Kashmir. Hira Lall and his family were evacuated from Srinagar in one such flight in October 1947 and came to Delhi never again to return to his native place.[4]

Like all men of means who were uprooted from their native place in the aftermath of partition of the country, he was penniless and sad that property worth lakes was left behind and nothing could be done about it. His sadness was further multiplied and he was heartbroken when he came to know that his personal library, which contained many manuscripts and invaluable books and which he had built up carefully over the last many years, was put to torch by the senseless rioters at Multan. He remained inconsolable for this loss, for days together. Such was his intense love for learning.

After initial harrowing experiences and short stay with relatives at Farrukhabad in U.P. he came over to Calcutta in 1948 in order to pick up threads of his lucrative business which he had left at Multan. Gradually business in Dyes and Chemicals was picked up in Calcutta and he did well till 1955. From the year 1949 he had come in contact with the great

literatures of Calcutta, such as Dr. Mohammad Ishaque, Dr. Kalidas Nag, Dr. Suniti Kumar Chatterjee, Dr. Makhanlal Roychowdhury, Dr. Zubayr Siddiqui and others, and his interest in literature and intellectual activities which lay dormant was rekindled. In due course of time, his interest in business gradually waned, and his interest in literary activities increased. He was often jokingly advised by Dr. Suniti Kumar Chatterjee. National Professor, to forsake the pursuit of Lakshmi and come back into the fold of Saraswati. Dr. Chatterjee's words proved prophetic. On the insistence of Dr. M.L. Roychowdhury, Hira Lall joined the Department of Islamic History and Culture in the University of Calcutta in 1955. He practically wound up his business in 1956 and thereafter devoted his whole time to teaching and writing.

In 1958, through the good offices of Dr. Ali Asghar Hekmat, Iranian Ambassador to India, who and developed a great friendship and had come to like Hira Lall for his poetic talent in Persian and his unbounded love for things Iranian, he was invited by the Imperial Government to visit Iran and deliver lectures in the University of Tehran. He went to Teheran towards the end of 1958. He delivered lectures on Indo-Iranian relatiosn and cultural ties. He recited his poetic compositions in Persian to the delight of his listeners. With his arresting personality, tall, well-built frame and traditional Indian attire of *Achkan* and *Chiridar,* so completely did he capture the imagination of the people of Teheran that wherever he went he was greeted and accepted as the embodiment of India and he became a roving ambassador of India in Teheran. He learnt to speak fluently in modern Persian. He used to converse like an Iranian and, therefore, was much sought after by the Iranian intellectuals, University teachers and students. He was also given assignments in the Indian Embassy by the then Indian Ambassador to Iran, Mr. T.N. Kaul.

He returned to India soon after Diwali in 1959 and took up his assignment in the Department of Islamic History & Culture in the University of Calcutta. He retired from this Department after rendering more than 25 years of meritorious service.

Now that he was armed with a *D. Lit.* In Persian from the Tehran University, he was appointed Chairman of the Board of Studies in Arabic, Persian and Urdu of the Calcutta University. He adorned this position for a number of years.

He was also instrumental in introducing Punjabi in *Gurumukhi* scripts in the curriculum of the Calcutta University up to B.A. and B. Com. Standards and was an Examiner in this language of the University of Calcutta and for Gurumukhi in I.A.S. Examination. Because of his

efforts, the Calcutta University was perhaps then the first and the only University in India outside Punjab to have introduced Punjabi in *Gurumukhi* script up to B.A. and B. Com. Standards.

He had come in contact with many freedom – fighters of this century including, Lala Lajpat Rai, Shaheed Bhagat Singh, Mahatma Gandhi, Netaji Subhas Bose, Jawaharlal Nehru, Sarojini Naidu, Dr. Rajendra Prasad, Dr. S. Radhakrishnan and Dr. K.M. Munshi, all of whom exercised profound influence on him and he espoused the cause of independence of the country through his inspiring speeches, writings and poetical compositions.

During his long stay in Calcutta from 1948 till he breathed his last on the 21st January, 1994, there was perhaps hardly any cultural, social and educational organization with whom he did not come in contact. He was closely associated with the Theosophical Society of India, Mahabodhi Society, Jain Organization, The Sikh Cultural Centre, Arya Samaj, Arzoo Majlis, Parsi Association, Armenian Society, Hanuman Mandir Trust and innumerable other cultural, social and educational organizations. He arranged and conducted Urdu *Mushairas* in Calcutta in which top-most Urdu poets such as Josh Malihabadi, Firaq Gorakhpuri, Jagannath Azad, Saghar Nizami and many others participated. He had been the President of the Punjab seva Samity, Calcutta, from 1981 to 1986. He was the Patron of the Punjabee Bradree of Calcutta and the monthly *The Sikh Review*, an organ of the Sikh Cultural Centre. He had been connected with the west Bengal Urdu Academy from its very inception. He was a Member of the Panel of the Bureau of Urdu Promotion, New Delhi. He was on the Managing Bodies of a number of schools in Calcutta. Besides, many other institutions and societies always sought his advice and guidance.

In the course of his long eventful life, Dr. Hira Lall Chopra won many awards and recognitions. Besides winning Gold Medal from the Punjab University, Lahore, for getting a First Class First in M.A. Persian for the first time, he was awarded the Imperial Government of Iran's Educational and Cultural Medal for promoting the Indo-Iranian cultural relations through his articles in English and Persian which appeared in literary Journals of Iran and India. He was also awarded in 1964, the Shahanshah of Iran's Coronation Gold Medal for services rendered to further strengthen the cultural ties of India and Iran. The President of India decorated him in 1984 with the Robe of Honour and Certificate of Merit for his Persian erudition which carried a life-long honorarium. In 1989, for literary services rendered, he was bestowed the *Ghalib Award*

and *Bhai Vir Singh International Award*. Many other academic institutions and religious organizations also decorated him with Awards, Recognitions and *Abhinandan Patras.*[5]

He started as an Urdu poet in early life and contributed Urdu poems and articles on social, cultural, religious and educational topics in various Urdu Journals and newspapers of Lahore from 1923 onwards. He wrote many Ghazals but his forte was Nazms which were topical and always carried a message. His language wa always forceful and meaningful. Among many poems he wrote, his *Nazms* on Holi (1946), *Jashn-i-Milad-un-Nabi* (1951), *Imam Husain* (1952), *Urdu* (1952), *Kalkutta Ki Club Mein Ek Sham* (1954), *Diwali* (1959) and an *Ode to Meher Baba* (1966), all in Urdu are worth mentioning.

After acquiring taste for Persian in graduate and post-graduate studies he wrote many poems in the classical moulds of Persian master-poets which became extremely popular. His visit to Iran acquainted him with modern Persian poetry in which he acquired proficiency. His satires in Persian poetry were penetrating and full of critique whereas his Odes, Qasidas and Istaqbalias were always laudable, praiseworthy and much appreciated. A special mention may be made of his Persian Ode to Dr. M. Ishaque (1950), *Salam-i-Hind ba Iran* (1952), *Ba Yd-i-Bu Ali Sina* (1952), *Qata-i-Naoroz* (1957), Salam to Imam, Qasidas in honour of His Majesty Shah Saud of Saudi Arabia and His Majesty the Shahahshah of Iran (1957) and I*staqbalias* in honour of Agha-i-Yakta (1952)m Sayendna Taher Saifuddin of Daudi Bohras, Dr. Ali Asghar Hekmat, Ambassador of Iran in India (1957) and Agha-i-Daktur Jalal Abduh, Ambassador of Iran in India.

It was indeed a Divine gift to him that he could compose poetry in Urdu and Persian spontaneously and effortlessly. His compositions exhibited an amazing catholicity of outlook and a profound understanding of human nature. His deep feelings for fellowmen, his gentle love of peace, his command of rhythm, his nobility of diction and appropriate use of similes and metaphors are the outstanding merits of his poetical achievements in Urdu and Persian.

He was an erudite scholar and a prolific writer. He wrote an article on Sufism in Cultural Heritage of India, Vol. IV. He wrote the first Hindi book on Iqbal's poetry in 1954 for which the U.P. Government awarded him a prize. He wrote a learned book on Persian Literature in Hindi which was highly appreciated by the Imperial Government of Iran. He also wrote an article on Bhai Vir Singh for the Abhinandan Granth which was presented to Bhaiji in Bombay.

Because of his superb proficiency in Urdu, Persian, Hindi, Punjabi and English, he wrote innumerable essays, pamphlets and prefaces in those languages. His writings were simple, clear and eminently readable; they brought knowledge, reflection, vigor and acuteness. Because of his in-depth study of principal tenets of all religious beliefs of his in-depth study of principal tenets of all religious beliefs and remarkable memory, his writings were usually embellished with gems from the Holy Scriptures. His style abounded with elegance, ease and sweetness. He was a fervent admirer of Sufis, Vedantists, Theosophists and other thinkers who had universal appeal. He devoted the whole of his life in inculcating true love for culture and literature so as to strengthen communal harmony and national integration in which he had unshakable faith. In his vast number of historical and philosophical works, he gave constant and abundant proof of his versatility, his penetrating mind, his true mastery over languages and his perfect craftsmanship. His learning was undoubtedly greater than his writing while his fecundity of thought and ready-wit was greater than both.

Now a few words about Dr. Chopra's gift as a public speaker by dint of long practice, he had come to develop great oratorical powers. He regaled his audiences with the outpourings of his heart. Sincerity stamped his syllables, and his courage of conviction threw vigor into his words. He did not pause for a suitable word nor did he lack ideas. His stentorian voice, remarkable memory and exhaustive study enabled him to eminently make his presence felt and acquit himself with perfect ease in any gathering. That is why his speeches used to be heard with rapt attention. His services as an orator were requisitioned by the Hindu, Muslim, Sikh, Zoroastrian, Jain, Buddhist, Theosophist and Christian organizations from where he preached 'Mutual Love and service' as the religion of man.

Dr. Hira Lall Chopra was very much social as far as his nature and principle are concerned and thus his popularity and fame spread across the country. Both by nature and by principle he was a very sociable man which was another of the elements in his permanent popularity. He stimulated the feeling for social reform but more than anything, he remained a life-long worker in the cause of communal harmony and national unity. He was a man of perseverance and when he took nap a cause and felt its righteousness, with unflinching zeal and assiduity, he pursued his path till he attained his object. Till his end he remained an unassuming figure of extraordinary simplicity and renunciation. Spartan, almost ascetic in his habits, he scrupulously avoided extravagance in public as well a private life. His concern for human welfare was genuine.

He had overcome the vicissitudes of life by sheer grit, courage and determination.

He was secular in religious thoughts of the world he never crashed anyone's feelings. His love for religious studies and devotion remained unabated and he passed a lot of his time in meditation. He was greatly influenced by Sufism, Vedanta and Theosophical philosophy and wrote many articles on these subjects. Through his speeches and writings, he always sought the youth to make them strong, intelligent, virtuous, brave, fearless, patriotic, austere and fit in every way to serve the mankind. He was endowed with a clear sight and a strong will.

Dr. Hira Lall Chopra was a renowned and erudite scholar but his scholarship and fame has not faded away after his death. Whenever occasions arise, in the many organizations with whom he was closely associated, for spontaneous fecundity of thought, readiness, scholarly rendition, literary vigor and wit, all those who knew him remember him and miss his absence even today with affection, respect and admiration.

Notes and References

1. Yousuf, K.M, A Layman,s Apprenciation of Dr. Hira Lall Chopra, Indo-Iranica, Kolkata,vol-48,(No. 1-4),1995, p.4
2. Chunder, P. Chandra, Dr. Hira Lall Chopra: A Tribute, Indo-Iranica, Kolkata,vol-48,(No. 1-4),1995,p.1
3. Yousuf, K.M, A Layman,s Apprenciation of Dr. Hira Lall Chopra, Indo-Iranica, Kolkata,vol-48,(No. 1-4),1995, p.3
4. Chopra, R.M., Dr. Hira Lall Chopra: A Tribute of a Son to his Father, Indo-Iranica, Kolkata,vol-48,(No. 1-4),1995, p.13
5. Ibid., p.16

Shama Rehmani

Research Scholar

C. A. S., Department of History

A. M. U., Aligarh

SULTAN SHAMS-UD-DIN ILTUTMISH: A SECULAR AND FARSIGHTED SOVEREIGN

ABSTRACT:

The present paper seeks to highlight the protective steps which were taken by Iltutmish for saving the infant state of Delhi Sultanate. He took such crucial decisions which tended his farsightedness to provide strengthen to the Sultanate. He was determined to employ such steps which were not easy to exercise. It occurred when Iltutmish with Junaid Burlas politely and tactfully diffused the pressure of the Ulema. However the Ulema gathered at his court and pressed him for implementing the Shariat law, mentioned by Barani in his, "Fatwa-i-Jahandari". Another significant resolution was the nomination of Raziah, his daughter, on the throne of the Sultanate. He ignored his incompetent sons completely. Sultan declared Raziah the heir of the kingdom. This really was a bold step during 13th century to choose a woman to adorn the sovereign in place of male brothers.

Key words:

Sultan Shams-ud-Din Iltutmish, Delhi Sultanate, Secularism, farsightedness, Shariat Law, Ulema, Sovereignty, Turkish Nobility, Raziah, Maliks and Nobles.

The present paper seeks to emphasize the precautionary measures taken by Iltutmish to save the infant *Sultanate* of Delhi. It so happened that when Iltutmish after Qutb-ud-din Aibek became *Sultan* of Delhi in 607 A. H. /1210 A. D (1). Some of the prominent *Ulema* approached at his court and pleaded to implement the *Shariat* law regarding non-muslims living in the kingdom. The *Ulema* argued that Delhi *Sultanate* had already come

in existence and *Sultan* got himself established himself unopposed and therefore *Shariat* law ought to be implemented without delay.

Iltutmish knew that *Ulema* were correct but he felt that the *Ulema* were an aware about the political climate and intention of non-muslims and around Delhi in particular and chaotic situation, lawless ness and insecurity through the length and breadth of the *Sultanate* in general. The newly born *Sultanate* too was yet to gather actual power. So while arguing with *Ulema* he did not answer them directly himself but asked Junaid Burlas, the prime minister, to answer the *Ulema* politely and tactfully.

Sudden death of *Sultan* Shihabuddin Gauri created a complicated situation among his leading slaves. The whole empire passed in to the hands of his *Muizzia Maliks*.(2) These primary slaves – Nasiruddin Qubacha, Tajuddin Yalduz and Qutb-ud-din Aibek were equally qualified for the throne of the Empire (3). Three initiated more to resistance on the basis of superiority for achieving the seat of government.(4) But out of the three, Aibek succeeded to acquire the throne of Hindustan (5). Undoubtedly he was capable among all the leading slaves of Shihabuddin Gauri (6). His informal accession took place on 25 June 1206, while formally he was succeeded to the throne in 1208 (7), probably including the deed of manumission (8). Iltutmish took over the Delhi *Sultanate* from Qutb-ud-din Aibek, who had a small spell of four years (1206-1210). Qutb-ud-din Aibek has been held as the first *Sultan* of Delhi *Sultanate* but it was Iltutmish who actually deserve the credit for saving the infant *Sultanate* from furious armed Hindus.

At that moment the political situation around Delhi was highly floating. *Muslims* in India were few in comparison to Hindus. According to Late Prof. Habib, "They (Hindus) were in majority, wanted to take revenge and gathered around Delhi." Turkish force was two small. Reinforcement from outside India was not possible. Rural areas were not safe. After sunset nobody was allowed to go out or come in at Delhi. Gates were opened after sunrise. They had arms and wanted to take revenge. From all directions they gathered around Delhi and were waiting for an opportunity.

The infant *Sultanate* needed strength, unity and consolidation. Reinforcement from outside though badly needed but its possibility was nil. Wherever the Muslims were, they were asked for security to remain with in town. The Muslims were not safe. So it was not easy for them to conquer North India.

The *Ulema* lacked political foresight. They thought of religious supremacy on politics. They did not realize politico military situation prevailed in India when Slave Dynasty took reigns of Delhi *Sultanate (9)*. When they learnt of establishment of *Sultanate* they thought for enforcing the provisions of the *Shariat* which required that in an Islamic state jimmy enjoyed no status equal to believers' *ahl-i-kitab*. According the *Shariat* Law a country inhabited by non believers (*dar-ul-harb*) was desired to be converted without delay into believers of Islam (*dar-ul-Islam*). The *jimmies* as per *Shariat* Law were required to embrace *Islam* or face death (*ama-ul-qatp* wa *ama-ul-Islam)*.

After the conquests of India, people had a dire need of secular state. They wanted combination of secularism in political affairs and lenience in religious sphere (10).

The eminent historian, Zia-ud-din Barani mentions in his, *"Fatawa-i-Jahandari*" that, "Sovereignty is never possible without practicing non Islamic customs." The *Sultanate* of Delhi is a secular institution and it was impossible to convert it into an extremist state (11). The attitude of a *Muslim* ruler toward non Muslims as put forwarded by Zia-ud-din Barani, in his book, *"Sahifa-i-Nat-i-Muhammadi*"(12). In which he recalls as how the *Ulema* gathered at the court of Iltutmish and put their point and how the *Sultan* through Junaid Burlas amicably, tactfully and without annoying any of them satisfied the *Ulema*. They took leave from the court with assurance that, whenever the state government becomes powerful, *Shariat* Law would be introduced and enforced. To quote, Zia-ud-din Barani:

"فاما درین وقت هندوستان نوگیر است و هندو چندان است که مسلمان درمیان ایشان به طریق نمک اند ک در آید بسیار بر نیاید که اگر حکم مذکور رایا ایشان کار خواهم فرمود نباید که یک دیگر شوند شیعه عالم شود وما ازاندکئی طاقت نیاریم و از هو طرف فتنه زاید –فاما چون چند سال بگذرد و دردارلمالیک و خطط و قصبات مسلمان (برایند) و لشکرها بسیار گرد آید ما البته با هنود "اما القتل" و به "اما الا سلام" پیش آمدنی ام "

"That at the moment India has newly been conquered and the Muslims are so few in number that they are like salt in a large dish. If the above orders are to be applied to the Hindus, it is possible they might combine and a general confusion might ensue and the Muslims would be too few in number to suppress this general confusion. However, after a few years when in the capital and in the regions and the small towns, the Muslims

are well established and the troops are larger it will be possible to give Hindus, the choice, either of Islam or death.(13)"

The *Ulema* returned satisfied with the answer and assurance given by Junaid Burlas as per tactful and diplomatic instance of the *Sultan.* Iltutmish thus solved the problem easily. Dangerous situation was averted and infant *Sultanate* was saved otherwise from being plunged unnecessarily into a long armed civil war with Hindus who were many times more than Muslims (14). Credit goes it *Sultan* Iltutmish who in his person absorbed liberalism and secular feelings right from childhood. As slave child he had association with many religious and liberal families(15). He also held blessings of Saints and Sufis (16). He ruled for more than a quarter a century with unusual courage and sense.(17)

No doubt he holds an outstanding personality among pearly rulers of Delhi Sultanate. Most of the people are the product of their environment. As a critical analysis of Iltutmish attitude shows that religious and liberal perception of a person must instigate when he had experienced of that environment(18). When he was at the age of ten, his brothers started jealousy towards him. They sold him in the slave-market of Bukhara to a kinsman of the *Sadr-i-Jahan* of Bukhara. This family of *Sadr-i-Jahan* was known for the sacred character. Minhaj calls this family holy and pious (19).

An incident took place in Bukhara which remarked a profound impression on his personality, "On a certain occasion one of the members of the family gave him a piece of money and ordered him to go to the *bazaar* and buy some grapes. He went to the *bazaar* and on the way lost the piece of money. Being of tender age, he began to cry for fear and while he was weeping a *fakir* came to him and took his hand, purchased some grapes and gave them to him, saying, "When you obtain wealth and dominion, take care that you show respect to *fakirs* and maintain their rights(20)". Shaikh Shihab-ud-din Suhrawardi used to tell about him, "I see gleams of royalty shining on the forehead of this man.(21)" Shaikh Nizamuddin Auliya told to his audience about his attitude: He had gained access to Shaikh Shihab-ud-din Suhrawardi and Shaikh Auhad-ud-din Kirmani. One of them prophesied that he would be a king (22).

When Iltutmish came to India as a slave of Qutb-ud-din Aibek, he was made to look after the *Iqta* of Gwalior. In 1203 he was appointed the governor of Badaun (23). His religious thought grew at Bukhara, Baghdad and became mature at Badaun and Delhi. From these places he imbibed a mysterious spirit of religion. After accession he continued to take keen interest in religious devotions and exercises. He used to offer *namaz*

punctually (24). Even on Military expeditions, special arrangements were made for congregational prayers (25).

Another a far sighted decision taken by Iltutmish was that he nominated Raziah as his successor (26). Disregarding his sons completely he chose his daughter Raziah to be his successor. The great *Sultan* Shams-ud-Din Iltutmish observed the signs of autonomy and elevated strength of mind in his daughter (27). After gaining control over the territory of Gwaliur, he arrived in to the capital city of Delhi and ordered his *Musharraf-i-Mumalik* (28) (secretary of the state) Taj-ul-Mulk Mahmud that a verdict should be announced that after his death his daughter would become his successor (29).

When people of the empire came to know about his announcement, they asked to the emperor that, "As you have adult sons, who are adequate for the dominion of the empire, so why a *Sultan* like you has taken decision for her daughter becoming as a successor and autonomous? So kindly solved the problems of our mind and deny your servant for this verdict.(30)"

After hearing those people, August *Sultan* very gently replied that, "All of my sons are engaged in the contentment of adolescence, and not any of them have potentials of administering the dealings of the kingdom." Because of this reason I have declared my daughter, my successor (31).

This was really a bold advancement that a woman regulating over the group of the males. The Turkish people could not resolve themselves with that idea. Even they forgot about those Turkish women, who enjoyed royal insignia and authority for many years (32).

Earlier during the absence of late *Sultan* Shams-ud-Din Iltutmish, Raziah administered some of the affairs of the state efficiently. This impressed so much her father (33). The reign of *Sultanah* Raziah was also significant from the viewpoint of that she was the first lady sovereign, who eternally succeeded to the throne of Delhi *Sultanate*. He acquired exactly what her father's wished for her (34)

Raziah's attainment to the throne of *Sultanate* manifested certain salient attributes. The first and for most characteristic was that, it was happened for the first time in the history of Delhi *Sultanate* that, the common masses of capital took resolution and inventiveness on the subject of succession. Till that time, when she remained stay within the capital city, there was no issue of uprising (35).

At the same time when she carried the appointments of the nobles and *Maliks* of the Kingdom, she carefully evaded that situation by which the

supremacy and influence of nobility was determined only in the hands of one section of society (36). She completely eliminated the possibilities of construction of section in the royal court. She determined to bring out the appointments and promotions of that section which comprised a list of Non *Turkish* Nobles and *Maliks* of the kingdom. Unfortunately it became one of the causes of her political destruction (37).

This was a keen observer decision which she has taken and promoted the nobility of Non-Turkish group. Soon she realized that, in cravings of Turkish nobles would prove an obstacle in sustaining the regulations of the peace and order throughout her reign. It was essential for the integrity of the country to curtail the authority of Turkish nobility (38) Raziah's one step towards appointment created a lot discontentment among the present nobility (39).

As far as concern the administrative machinery of *Sultanah* Raziah, she ruled over the sultanate of Delhi for three year, six month and six days effectively (40). She has amalgamation of maneuverings, competently, exhibited imminent into war accomplishments, efficiently put into practice her sovereign resolutions, tactfully acquiescent the disobedient *iqta* assignees and a keen observer. One important characteristic of her personality was that, her capability to augment over the chauvinism of her epoch and era.

She was the first choice of her father for the throne. Her endowments compelled August *Sultan* Iltutmish in such an extent that he declared Raziah, the heir of the kingdom to ignore his incompetent sons completely (41). Her father provided the best means of appropriate guidance over the issues of organization (42).

Thus, historically it was correct to say that she not only secured her position as the first lady *Sultan* of Hindustan but efficiently administered the *Sultanate*. Iltutmish was not bothered about the *Turkan-i-Chahlghani-i-Shamsi*, when he nominating Raziah as his successor. It was a daring innovation. It could not easily reconcile with the idea of a woman ruling the *Sultanate.* It had no parallel events in the history of *Islam.* He also could not act as per the advice of the *Ulema* who continuously pressed him for implementing of *Shariat* law. Political realism, common sense and the true spirit of religion made him reject the demand of the *Ulema*. He knew that toleration was the need of the time for having strong empire. For giving unity to his state he had to follow a path of religious toleration. If he propagated only one religion, he could not rule over the whole common people. Definitely he was a religious man but he was not a fanatic ruler. He protected the *Sultanate* which still was infancy.

References

1 *Sultan* Shams-ud-Din Iltutmish came from the *iqta* of Badaun and ascended the throne of the *Sultanate* of Delhi. *Tabakat-i-Nasiri* (tr), P. 606.

2 This is the term used for the Maliks of the Sultan Muizz-ud-din. After the victory over the Khurasan, Shihabuddin Gauri styled his name as Muizz-ud-Din. *Tabaqat-i-Nasiri*, p. 69; also see *Political History and Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi*, p. 97.

3 *A Comprehensive History of India*, *vol. v*, p. 198.

[4] Ibid., p. 199.

[5] Ibid., p. 199.

[6] Ibid., p. 199.

[7] *Epigraphia Indo Moslemica*, 1911-1912.

[8] Deed of Manumission means a person release from the slavery of his master; spend his life as a free man. It was a kind of unique honor. It was not clearly mention whether he received this kind of honor or not. Though Muizz-ud-Din still not manumitted senior slaves like Yalduj and Qubacha.

[9] *Studies in Medieval Indian History and Culture,* p. 24.

[10] *Politics and Society during the Early Medieval Period*, p. 17.

[11] *Fatwa-i-Jahandari, f. 159 a*. The Rotogrph of this M.S. preserved in the British Museum.

[12] *Sahifa-i-Nat-i-Muhammadi.* The M.S. of this work preserved in Raza Library in Rampur*; also see Medieval India Quarterly Vol. 1 Nos. 3-4 pp*. 100-105; also see *Studies in Medieval Indian History and Culture*, p. 23.

[13] *Sahifa-i-Nat-i-Muhammadi*, c.f., *Studies in Medieval Indian History and Culture*, p. 24.

[14] *Studies in Medieval Indian History and Culture*, p. 23.

[15] Ibid., p. 15.

[16] Sultan Iltutmish had personal experience of Sufi saints like Shaikh Shihabuddin Suhrawardi, Qazi Hamid-ud-Din Nagauri, Shaikh Auhad-ud-Din Kirmani, and Shaikh Nizam-ud-Din Auliya. *Siyar-u'l Arifin, M.S.* , p. 27; See also *Fawa'id-ul-Fu'ad*, p. 212.

[17] *Tarikh- i- firozshahi,* p. 27; also see *Studies in Medieval Indian History and Culture,* p. 13.

[18] *Studies in Medieval Indian History and Culture*, p. 15.

[19] *Tabakat-i-Nasiri,* p. 167.

[20] Ibid., p. 167.

[21] *Siyar-ul-Arifin, (MS)* p. 27.

[22] *Fawa' id-u'l-Fu'ad*, p. 212.

[23] *Tazkirat-ul-Wasilin* (a detailed account of the saints of Badaun), pp. 9-10.

[24] *Tabaqat -i-Akbari*, p. 30.

[25] *Tabaqat-i-Nasiri*, p. 175; *Tabakat-i-Nasiri*, p. 615; see also *Adab-u'l-Harb* for an interesting discussion on the arrangements for prayers in battlefields.

[26] *'Sultana Raziah', Indian Historical Quarterly*, p. 754.

[27] *The Foundation of Muslim Rule in India*, p. 114.

[28] The term M*usharraf-i-Mumalik* basically used for the examiner of the records, not for the *wazir*. And *Dabir* supplies the meaning of Secretary. Minhaj told in his text Taj-ul-Mulk, Mahmud *Dabir*. Collectively refer the meaning of Taj-ul-Mulk, Mahmud Dabir is Crown of the state Mahmud *Dabir* (Secretary).

[29] چون سلطان در ناصیه او اثار دولت و شهامت میدید، اگر چه دختر بود و مستوره بعد آنکه از فتح کالیور مراجعت فرمود، تاج الملک محمود دبیر را رحمه الله، که مشرف مملکت بود فرمان داد : تا او را ولایت عهد نبشت و ولی عهد سلطنت کرد ،

Tabaqat-i-Nasiri, p. 458.

[30] در وقت نبشتن آن فرمان، بندگان دولت که بحضرت سلطنت او قریبی داشتند، عرضه داشت کردند : که با وجود پسران بزرگ که سلطنت را شا یانند، دختر را پادشاه اسلام و ولی عهد میکند چه حکمت است ؟ و نظر پادشاه (ها) نه برچه معنی است ؟ این اشکال را از خاطر بندگان رفع فرماید، که بندگانرا این معنی لایق نمی نماید.

Tabaqat-i-Nasiri, p. 458.

[31] سلطان فرمود: که پسران من بعشرت و جوانی مشغول باشند، و هیچکدام تیمار مملکت ندارند، و ازیشان ضبط ممالک نیاید شما را بعد از فوت من معلوم گردد (که) ولایت عهد را هیچ یک لا یقتر از و نباشند، و حال همبرین جمله بود، که آن پادشاه سعید دانا فرمود(ه بود) علیه الرحمه.

Tabaqat-i-Nasiri, p. 458.

[32] *Some Aspects of Muslim Administration*, p. 28.

[33] *Tabaqat-i-Nasiri*, p. 455; See also *Tarikh-i-Ferishta*, *History of the Rise of the Mahomedan Power in India* (tr), p. 121.

[34] *Sultana Raziya, Her Life and Times: A Reappraisal*, p. 17.

[35] *A Comprehensive History of India, vol. v*, p. 237.

[36] *Political History and Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi (1206-1290)*, p. 195

[37] *Sultana Raziya, Her Life and Times: A Reappraisal*, p. 19.

[38] *Tabakat-i-Nasiri*, pp., 642-643.

[39] *Tabaqat-i-Nasiri,* p. 460.

[40] Ibid.,p. 462.

[41] Ibid., p. 458.

[42] Ibid., p. 457; See also *Political History and Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi (1206-1290*), p. 195.

Bibliography:

- Minhaj-us-Siraj Jurjani, *Tabaqat-i-Nasiri*, ed., Abdul Hayy Habibi, Anjuman Tarikh Afghanistan, Kabul, 1332.
- Minhaj-us-Siraj Jurjani, *Tabakat-i-Nasiri*, tr. by Major H. G. Raverty, Low Price Publication, New Delhi, 2010.
- Mohammad Aziz Ahmad, *Political History and Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi*, Oriental Books Reprint Corporation, New Delhi, 1972.
- Mohammad Habib and Khaliq Ahmad Nizami, *A Comprehensive History of India*, *vol. v*, People's Publishing House, New Delhi, 1970.
- *Epigraphia Indo Moslemica*, 1911-1912.
- Khaliq Ahmad Nizami, *Studies in Medieval Indian History and Culture,* Kitab Mahal Private LTD, Aligarh, 1966.
- Mohammad Habib and edited by K. A. Nizami, *Politics and Society during the Early Medieval Period*, People's Publishing House, New Delhi, 1974.
- Zia-ud-din Barani, *Fatwa-i-Jahandari, f. 159 a*. The Rotograph of this M.S. preserved in the British Museum.
- Zia-ud-din Barani, *Sahifa-i-Nat-i-Muhammadi*. The M.S. of this work preserved in Raza Library in Rampur.

- *Medieval India Quarterly Vol. 1 Nos. 3-4.*
- Zia-ud-din Barani, *Tarikh- i- Firozshahi, Calcutta Asiatic Society, Bengal, 1862.*

- Amir Hasan 'Ala' Sijzi Dehlawi*, Fawa' id-u'l-Fu'ad*, tr. By Zia-ul-Hsan Faruqi, D. K. Print World, New Delhi, 1996.
- Razi-ud-din, *Tazkirat-ul-Wasilin* (a detailed account of the saints of Badaun).
- Nizamuddin Ahmad, *Tabaqat -i-Akbari*, Naval Kishore, Lucknow, 1875.
- *Adab-u'l-Harb* for an interesting discussion on the arrangements for prayers in battlefields.
- A.B.M. Habibullah., '*Sultana Raziah', Indian Historical Quarterly,* Dec, 1940.
- A.B.M. Habibullah, *The Foundation of Muslim Rule in India*, Central Book Depot, Allahabad, 1961.
- R. P. Tripathi, *Some Aspects of Muslim Administration,* Central Book Depot, Allahabad, 1978.
- Ferishta, *Tarikh-i-Ferishta*, *History of the Rise of the Mahomedan Power in India*, tr. by John Briggs, Low Price Publication, Delhi, 2006.
- Jamila Brijbhushan, *Sultana Raziya, Her Life and Times: A Reappraisal*, Manohar Publication, New Delhi, 1990.
- *Siyar-ul-Arifin,* (MS).

Mohmad Ibrahim Wani
(Research Scholar),
Deptt. of Persian, University of Delhi

DARA : FROM DEFEAT TO DEATH

A SUMMARY OF MANUCCI[1] AND BERNIER'S[2] ACCOUNTS

ABSTRACT

Dara Shukoh was the eldest beloved son among the four sons of Shah Jahan, who unlike his brothers particularly Aurangzeb, was primarily a mystic who happened to be a prince. He endeavored to find a common ground between different religions. It was the main reason of the ill feelings between Aurangzeb and Dara which lead to a civil war, resulted on the Aurangzeb's victory and Dara's death. Many European travelers and writers including Niccolao Manucci and Francois Bernier have narrated this most traumatic drama in Mughal history in their accounts. In this paper an attempt has been made to summaries their writings for readers.

KEY WORDS

Dara, Aurangzab, Manucci, Bernier, War, Death.

INTRODUCTION

Shah Jahan, born on the night of 15 January 1592 in Lahore to the Rajput Princess Jagat Gossain, also called Jodh Bai, daughter of Uday Sing Rathor of Marwar, ascended the Mughal throne on January 1627 A. D.[3] In March 1657 A. D. he celebrated the thirtieth lunar anniversary of his accession and began the thirty-first year of his reign. Till now all his four sons, Dara, who had just reached to 42, Shah Shuja 41, Aurangzeb 39 and Murad 33, had gained experience as governors of provinces and commanders of armies. Although from the same mother, there was no brotherly love among them. The ill feelings between Dara and Aurangzeb in particular was so bitter and had continued to grow bitterer for so many years past that it was the talk of the whole empire. While Dara contemptuously called Aurangzeb a nemazi, bigot, Aurangzeb damned Dara as a mulhid, infidel [4].

Dara had taken after his great-grandfather Akbar, but there was this basic difference between them that, writes Abraham Eraly "while Akbar was primarily a king who happened to be a keenly interested in religion, Dara was primarily a mystic who happened to be a prince. " This , that if Dara obtained throne and established his power, the foundations of the Islamic faith would be in danger, was a genuine anxiety. Dara was not an apostate. "Born on a Mahomet an faith, he continued to join the exercises of the religion, " states Bernier[5]. Dara was devotee of Mula Shah, a celebrated Muslim saint of Qaderia order of Sufi's, and had compiled a biography of Muslim Saints, Safeenat-ul-Awliya , Sakinat-ul-Awliya, a biography of , Mula Shah and his Pir, Guide, Mian Mir, besides Risaala-i-Haq Numa, Hasanaat-ul-Arefeen and Tariqat-ul-Haqiqat. Dara was however eclectic and inclined to pantheism, which is evident from his writings as well as his Persian poetry.

Dara in the very first couplet of his Diwan, a collection of poetry says :

همه موجود در وجود ما گنج مخفی است در نمود ما

Everything there is in our being, treasure is hidden in our appearance

Or

نیست چیزی بجز خدا موجود خواه اندر خفا خواه شهود

You see inside or out side, Nothing is there with out a Khuda (God)[6]

Dara in his thirst for pantheistic philosophy studied , the Talmud, the new Testament, the Upanishads and with the help of Hindu pundits from Varanasi, himself translated the fifty Upanishads from Sanskrit into Persian. His aim was to find a meeting point for different religions in those universal truths which form the common basis of all true religions and which fanatics are too apt to ignore in their zeal for the mere externals of faith. He especially sought to reconcile Hinduism with Islam and wrote a book – Majmau-ul-Baharain (Mingling of two oceans) to promote his thesis. Alike from the Hindu Yogi Lal Das and the Muslim faqir Sarmad, he had sat as an attentive pupil. Such a view was not, and even is not unusual for a liberal Muslim like Aurangzeb.

On 16th September 1657 A. D. Shah Jahan suddenly fell ill. The emperor was attacked with serious illness in the form of Strangury, constipation and other sympathetic affections. Physicians tried all the remedies of their art but in vain, for the disorder increased. Manucci and Bernier, both attribute Shah Jahan's illness to the use of an astringent

aphrodisiac. " Shah Jahan brought his illness on himself, " says Manucci, "For being already an old man …he wanted still to enjoy himself like a youth and with this intent took different stimulating drug's.[7] Manucci adds.

For about a week Shah Jahan's conditions was deemed critical and he neither attended the Durbar nor showed himself to the public at the Jharoka. No one but Dara and a handful of trusted amirs had access to him. As the emperor disappeared from sight the rumor that he was dead – poisoned by Dara, some said –raged through Delhi like wild fire , spreading panic. "Merchants closed their shops, fearing riots, says Dahiya."[8] To still the rumors, he adds , Shah Jahan dragged himself to the window of his bedroom on 24th September, to show his face to the public gathered in the maidan below the fort walls, but many refused to believe their eyes. "But the greater part of them, said that it was not Shah Jahan , but a made-up figure prepared by Prince Dara for that purpose, " writes Manucci. After a month Shah Jahan began to recover his strength. He then shifted to Agra as physicians had recommended a change of air. By mid-November, nursed diligently by Dara and Jahan Ara, Dara's sister, Shah Jahan recovered his health but he would never recover his power.

Before Shah Jahan left Delhi, he formally nominated Dara as his successor, and had commanded the amirs to obey him as their sovereign. This was a grave mistake, writes Abraham Eraly, as it proved fatal. Dara had long been groomed to succeed Shah Jahan, and was always kept at the court to familiarize him with the imperial administration. Conferred the grand title Shah-i-buland Iqbal, Lord of the lofty fortune. "He had the exclusive privilege of sitting in the Durbar hall, in a gold chair just below the imperial throne, though Dara never sat on that in the presence of Shah Jahan", writes Banarasi Das Saksen.[9]

Dara was a popular prince and Shah Jahan loved his company. Dara , complains Aurangzeb, won Shah Jahan's favor by "flattery smoothness of tongue, and much laughing. " Says Manucci. " Dara was a man of dignified manners, of a comedy countenance joyous and polite in conversation, ready and gracious of speech, of most extraordinary liberality, kind and compassionate. " Confirms Bernier. He adds " Dara was a cultured, benevolent and warm-hearted prince, who often interceded to soften the harshness of Mughal rule. "

At the time Shah Jahan fell ill Dara was with the emperor in Delhi. Shuja was in the Bengal, Aurangzeb in Deccan and Murad in Gujrat. As the wild rumor about the emperors conditions reached the imperial princes in their provinces, they tensed with apprehension. If Shah Jahan

was dead or if he was incapacitated and had relinquished power to Dara, their fate was sealed. It was not merely an issue of succession, but of their very lives as well. As Beriner put's it "Not only was the crown to be gained by victory alone, but in case of defeat life was certain to be forfeited. "

THE WAR OF SUCESSION

The war of succession between the brothers was the most traumatic drama in Mughal history , says Abraham Eraly. On receiving the rumor that Dara had poisoned his father, proclaimed himself emperor and had the khutbah read and coins struck in his name, Shuja started from Agra with his army to avenge, as he claimed, his fathers murder. " Ya tukht ya tabut, (یا تخت یا تا بوت)" He exclaimed as he set out –The throne or the tomb!, Abraham Eraly adds. When this news reached Agra, Dara obtained Shah Jahan's permission to send an expeditionary force against him. The army that was marshaled for it was not large but it was the pick of Dara's army, and was commanded by his eldest son Sulieman Shukoh, who was assisted by two great generals, Raja Jai Sing and Daler Khan. In the midway when Sulaiman was preparing to engage Shuja at Manger, he received an urgent message from Dara ordering him to make peace with Shuja and rush back to Agra as Aurangzeb had smashed through Jaswant's army in Malwa, under whom Dara had sent an army to take Malwa from Shayista khan, a suspected Aurangzeb's loyalist, Sulaiman as ordered ceded Bengal, Orisa and eastern Bihar to Shuja and immediately set out for Agra, but it was already too late. Suliaman was still 400 kilometers from Agra when the decisive battle between Dara and Aurangzeb has started at Samogarh near Agra on 8th June 1658 A. D.

Aurangzeb, writes Withington "after making an agreement with Murad, according to which Murad was to get Afghanistan, Kashmir, Punjab and Sind, nearly one third of empire, crossing the Chambal, a tributary of the Yamuna River, with Murad arrived at Samogarh on June 7, 1658 A. D. , with an army about 50, 000 [10]," Dara, who had set out from Agra with the blessings of his father and with his army on 28th May , drew up his forces and advanced, as it to give battle right away. That would have been the right decision, for as Aurangzeb's army was exhausted from a long journey march and his guns were not in position. Inexplicably after advancing a short distance, Dara halted. He did that says Manucci, because, "traitors intervened on astrological grounds by saying that neither the day nor the hour was favorable…All this they did solely that Aurangzeb might have time to take rest, to refresh his people and secure the arrival of his guns. "

All day long , writes Jadunath Sarkar , " the two armies in steel armor stood in battle array on the blazing sands under a broiling summer sun" [11] . Many soldiers fell where they stood from exhaustion, horses and elephants wilted. " The day was so hot that many strong men died from heat of their armor and want of water, " writes Munecci. The next day, 8th June well before dawn, both Aurangzeb and Dara began to marshal their forces. By eight , Aurangzeb was on move, and by nine he was within the sight of his brother, Dara, who greeted him with fierce salvos of artillery. Aurangzeb replied briefly, then held his fire, as the armies were still beyond the range of the guns. Dara kept up the cannonade.

The battle of Samogarh lasted barely three hours; it began around nine in the morning and by noon all was over "Initially everything went in favor of Dara but", writes R. S. Chaurasia "Dara committed the greatest blunder of his life. He dismounted from his elephant, which created panic among his soldiers who thought Dara was dead.[12] " Dara who was ignorant of the rules of war and lacked experience in command, as he was never tested in the battlefield, lost some 10, 000 men and battle as well. Fleeing from the battlefield Dara headed for Agra. Pausing along the way for a short rest, he reached the city by about nine in the night. By then Agra knew of his tale. "The whole city was in uproar," reports Manucci. In the imperial harem, and in Dara's palace women wailed.

Shah Jahan tried to consol Dara by removing the sting of shame from the defeat. " What was brought you down to such a state is only the decree of fate, " he wrote to Dara . "It is better for you now to come to see me, after hearing what I have to say, you may go wherever fate leads you, what is predestined for you will happen in every place you may be" Shah Jahan is supposed to have wrote, says Bernier. But Dara was too ashamed to meet his father. He replied "I have no face to appear before his majesty in my wretched plight, " writes Manucci. Dara quickly gathered his family –his wife Nadira Banu, his children and grandchildren –and in the dead of night fled towards Delhi.

Breaking his word pledged on the Quran, Aurangzeb arrested Murad and marched on to Delhi from where Dara had long since fled to Lahore, where he was recruiting a fresh army. Aurangzeb arrived in Punjab within weeks after Dara, forcing Dara to flee again. By the time Dara reached to Multan his newly recruited army had shrunken to 14, 000 from 20, 000 and half of them deserted him as he fled again on the approach of Aurangzeb. As Dara retreated from Multan Aurangzeb himself turned away from Dara, leaving it to his generals to continue to chase, hastened back to Delhi to deal with a fresh emergency there caused by Shuja's

suspicious movements from Rajmahal to Patna. As Aurangzeb was confrontering Shuja, Dara reached to Gujrat on January 1659 A. D. , there he found favor with Shah Nawaz, the governor who although was Aurangzab's father-in law, opened the provincial treasury for Dara and helped him to recruit an army of 22, 000 men, cannons were produced from Surat. Dara can dreamt about his lost throne again.

Meanwhile Aurangzeb having returned from the battle with Shuja was rapidly closing in on Dara. So there was no time for Dara to withdraw safely into Gujrat. He had run enough anyway. The time had come for Dara to make a last stand. So advancing towards he took a carefully chosen position at Deorai, seven kilometers south of the town. On 21 March 1659 A. D. Aurangzeb arrived at Deorai and encamped three kilometers east of Dara's position. The battle was joined the next day. Unlike the three hour battle of Samogarh, at Deorai battle raged on for an unprecedented three days but result was the same as of battle of Samogarh. Dara, writes Manucci, "was not lacking generalship, but luck. : Dara in the dark of night , accompanied by his fifteen year old son Sipihir Shukoh, wife Nadira Banu and a small band of followers fled and somehow managed to reach Gujrat but there he found Ahmadnagar closed to him by Aurangzeb.

Dara's situation was pathetic. He was utterly destitute, dressed in a thin linen tunic and cheap shoes. Bernier who was accompanying Dara writes, "the shrieks of the females drew tears from every eye". Dara's only thought now was to save himself and his family, so for that he wanted to flew to Persia. On the Way to Bolan pass his favorite wife Nadira Banu passed away. As per her wish to get buried in India Dara sent her body to Lahore to be buried in the tomb of Mian Mir, Dara's spiritual preceptor. Before Dara could resume his journey he needed a little time to compose himself, to tap the very last reserves of will and energy to keep going. But from here Dara had to go nowhere but to come back to Delhi as a captive as "Dara was betrayed and arrested by an Afhgan tribal chief, Malik Jiwan. " say's Chaurasia[13].

At Dadar, a mere fourteen kilometers east of the Bolan Pass and Safety, Dara sought a moments respite with Malik Jiwan. " Dara had a good reason to expect hospitality from Malik, " says Manucci. For Malik owed his very life to Dara, who had once interceded to save him after Shah Jahan had ordered him to be trampled to death by an elephant for an offence against state . " The evil zamindar, Malik Jiwan came out like a destroying angel to meet him, " says Bernier. Dara's women pleaded him not to go to the Pathan, but, " Dara , as if hurried away by his evil genius,

" would not listen, adds Bernier. When Dara arrived at Dadar, Malik waited on him three kilometers out side his fort and conducted him to his house with all honor and courtesy. For three days Dara rested three.

On 19th June, Dara began the short trek towards the Bolan Pass . There was no haste now . Safety was close at hand . But so was Malik. "Tribal honour would not molest Dara as long as he was his guest, " says Manucci , " but once Dara left the fort, he was fair game for the predator." "Dara was a limpy prey, writes Bernier, "When Malik swooped down on the fugitives, there was no resistance, except from Sipihr Shukoh, who was too young to die, " Bernier adds. On getting word from Malik of Dara's capture, Jai sing and Bahadur Khan, Aurangzeb's generals reached there on 3rd July 1659 A, D. and took charge of the captive.

Three months later , on 2nd September 1659 A. D. , Bahadur khan arrived in Delhi with the captives. A week later, on 8th September on Aurangzeb's specific orders Dara and Sipihir were paraded through Delhi in an open hawdah mounted on a filthy, small and mangy female elephant. " Broken and weary like a crushed twing ", says Bernier, "Dara sat limply, dressed in rags, a dingy turban on his head, his feet chained. " Siphir sat besides Dara and right behind them sat Aurangzeb's slave Nazar Beg with a drawn sword, threatening instant death to the prince in case of a rescue effort, Adds Manucci. Entering Shahjahanabad through the Lahore gate, the somber parade passed through the length of the city, through Chandani Chowk and the bazaar and then went on to Khizirabad, a suburb of Delhi where Sara was lodged. "The crowd assembled upon this disgraceful occasion was immense; and everywhere I observed the people weeping and lamenting the fate of Dara in the most touching language…" says Bernier.

On the evening of the day Dara was paraded through Delhi, his fate was debated in the Diwan-i-khas. Only one Amir, Danishmand Khan pleaded for mercy, but most, among them was Dara's uncle Shaista Khan, recommended death. And behind the scenes, malevolent Roshanara –" his sister but his mortal enemy, " as Manucci describes her – clamored for blood. " There were, in any case overwhelming political reasons for executing Dara, " writes Bernier. Aurangzeb's conniving counselors every ready with the advice he wanted to hear, told him that if Dara did not die, people would be ever looking for his release and this would be a source of disquiet in the empire , Says Bernier. On learning of death decree, Dara made an direct appeal to Aurangzeb to save his life. " My Lord brother and emperor, " Dara wrote to Aurangzeb, says Bernier " the desire of kingship is not at all in my mind, Be it blessed to u and your

sons, if u only grant me a house fit for my residence and one young handmaid out of my own handmaids to wait on me, I shall employ myself in praying for your good in the retired life of a pardoned man. ”

Aurangzeb did not want Dara’s prayers. He wanted his head. On the margin of Dara’s petition he wrote says Manucci, “ You first acted as an usurper, and you were a mischief. ” 9th September 1659 A. D. , Dara was stabbed to death. The executers then hacked off his head and took it to Aurangzeb for verification. “On that night Roshan Ara Begum gave a great feast, ” writes Manucci. He further tells a ghoulish tale of Aurangzeb jabbing his brothers served head three times with his sword and then, “with great glee, ” sending the head to Shah Jahan in Agra, whom he has imprisoned there, to be placed on the old man’s table in a covered dish when he sat down to dinner.

On Aurangzeb’s orders, the headless corpse of the prince was paraded through the bazaar on an elephant, before being buried, unwashed and unadorned, in a vault in the tomb of Humayun, Dara’s blighted ancestor.

CONCLUSION

Dara was the most cultured among the four sons of Shah Jahan. He was infact the finest scholar the Mughal dynasty had ever produced. Dara was not an apostate as Aurangzeb damned him, Dara however was electic and inclined to pantheism, which is evident from his writings as well as his poetry. His aim was to find a meeting point for different religions. He especially sought to reconcile Hinduism with Islam. Dara’s views were not unusual for a liberal Muslim like Aurangzeb. Dara did not usurp power: power was delegated to him, he did not cause civil war; it was forced on him. Dara’s promise was of a humane, progressive future. It was chance and ill luck that destroyed Dara. When he was executed, what was involved was not just the death of a prince, but the death of a future.

REFERENCES

-

[1] Niccolao Manucci (1638-1717) was an Italian adventure who visited India in 1656 A. D. and was associated with the Mughal court for over half a century. His book “Storia do Moguru”, written in Italian and later on translated into English by William Irvine in 1907-08, is considered to be the most faithful and vivid picture of Mediaeval India.

[2] Francois Bernier (1620-1688) was a French Physician who was the personal physician of Dara Shukoh and eyewitness of all events related to Dara’s defeat to death. Bernies account “Travels in the Mughal empire” was translated from French into English by Archibald Constable.

[3] Eraly, Abraham, the Great Mughals, Viking, 1997. p 299

[4] Eraly, Abharam, The Great Mughals, Viking, 1997. p 336

[5] Bernier, Francois, Travels in the Mughal Empire, Trans. Archibald Constable, Delhi, 1989.

[6] Diwan-e Dara Shoukh, Ahmad Nabi Khan, Lahore, 1969 P 3 , 35
[7] Manucci, Niccolao, Storia do Mogru, 4 vols. , Tr: Williams Irvine, London 1907-08, Delhi, 1989
[8] Dahiya, B. S. The History of Hindustan vol 3, Sonipat Haryana 1772 p 120
[9] Saksena, Banarasi Prasad :History of Shah Jahan of Delhi, Allahabad, 1932 and 1969
[10] Withington, Nicholas, (An English traveler in india in the 17th century), His accounts in Early Travelers in India Edited by William Foster. Delhi 1968.p 122
[11] Sarkar, Jadunath, A Short History of Aurangzeb, Hyderabad , 2009 p 53.
[12] Chaurasia, R. S, History of Medieval India, Delhi, 2002 and 2011. p 261
[13] Chaurasia, R. S, History of Medieval India, Delhi, 2002 and 2011. p 262

BIBLIOGRAPHY

1. Ahkam-i-Alamgiri by Hamid-ud-din Khan Nimcha translated by J Sarkar as Ancedotes of Aurangzeb Calcutta, 1928/1988.
2. Aurangzeb by Lane-Poole Stanely , Delhi, 1971.
3. Akbar and Religion, Khaliq Ah. Nizami, New Delhi, 1909.
4. A Social History of Islamic India, Yasin, Mohammad, Lucknow, 1958.
5. A Short History of Aurangzeb, Jadunath Sarkar , Hyderabad, 2009.
6. Dara Shikuh by Hasrat Bikrama, Visvabharati, 1953.
7. Early travels in India by Foster William, Delhi, 1985.
8. From Akbar to Aurangzeb, W.H. Moreland, London, 1990.
9. History of Shah Jahan of Delhi, Bansari Das Saksena, Allahabad, 1932/1969.
10. Maasir-i-Alamgiri by Mustaid Khan Translated by J. Sarkar, Calcutta, 1947.
11. History of Medieval India, R.S. Chaurasia, Delhi, 2002.
12. Ruka'at-i-Alamgiri, or Letters of Aurangzeb, Aurangzed, Translated by Jamshid H. Bilimoria London, 1908/New Delhi, 1972.
13. Shajhana-nama,Inayat Khan, Translated by W.E. Begley, & Z.A. Desai Oxford, Delhi, 1990.
14. The History of Hindustan Vol. III by Dahiay B.S., Sonipat, 1772.
15. The Great Mughals, Eraly Abraham, Viking, 1997.
16. Travellers India by H.K. Kaul, Delhi, 1979.